

سید رشید الدین عظیمی

”ہیک ڈارلنگ! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ مسز نامیہ یوسف اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تھیں۔
 ”بس ماما! صرف ایک منٹ اور۔“ وہ اپنے چہرے پر کیے گئے ڈارک ہیک اپ کو آخری جگہ سے کر پٹتی تھی۔
 ”اولا! ماما! آج تو آپ پہلے سے زیادہ زبردست اینڈ بیوٹی فیل لگ رہی ہیں۔“ اس نے سٹائش بھری نگاہوں سے مسز
 نامیہ یوسف کا بھرپور جائزہ لیا تھا، جنہوں نے سنگ کی ہلیک اینڈ کرے ساڑھی باندھی تھی، نازک ہی ہم رنگ جیوہری میں،
 چہرے پر نقاست سے کیے گئے ہیک اپ اور آنکھوں پر لگا نازک گولڈن، آئی گلاسز انہیں بے حد گرہیں فل بنا رہا تھا۔

مکمل ناول

”سو ہیٹ چائلڈ! لگ تو آپ بھی بہت پیاری رہی ہیں۔“ وہ ایسے ایک بات ہے آپ پر یہ پر ہلک کر کافی سوٹ کرتا ہے۔“
 انہوں نے نرمی سے اس کے گال چھوئے تھے۔ اس لیے سلجوق موسیٰ کوریسیو کرنے آپ اسی کمرے میں جائے گا۔ اینڈ آئی بیوڈ
 کہ وہ آپ کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں فریفت ہو جائیں گے۔“
 ”ریلی ماما!“
 ”او ایس! ریلی ماما! چائلڈ!“ اور اس سے پہلے کہ مسز نامیہ یوسف اسے سلجوق موسیٰ کو اپنا گرویدہ کرنے کی ٹیس دیتیں، وہ
 فوراً بول پڑی تھی۔

”ماما! میرے خیال میں ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ اس نے اپنی نازک کلائی پر بندھی گولڈن گھڑی آگے کی تھی۔
 ”اومانی گاڈ، آپ سے باتیں کرنے کے چکر میں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔“ چلیے، وہاں سارے مہمان ہمارا ویٹ کر رہے ہوں
 گے۔“ وہ دونوں سمیٹا رپارٹی اینڈ کرنے لگی تھیں۔

مسز نامیہ یوسف ایک سوشل ورکر وہ ہیں تھیں، جن کے کئی ادارے چل رہے تھے۔ جنہیں وہ نہایت ایمانداری اور
 دیانتداری سے چلا رہی تھیں۔ جن میں قابل فور نام شیم و مسکین بچوں کی امداد کرنا، بے سہارا و لاچار اور بیوہ عورتوں کو سہارا
 فراہم کرنا، مجبور و بے بس عورتوں کی حق کی لڑائی لڑنا ان میں شامل ہے۔ آج کل وہ ہر اخبار کی منظور نظر تھیں۔ اپنا یہ کام خوش
 اسلوبی اور ایمانداری سے سرانجام دینے کی وجہ سے وہ میڈیا میں بھی کافی مقبول و معروف تھیں۔ مسز نامیہ یوسف اپنی اتنی
 شہرت، اتنی عزت پر نہایت نازاں تھیں۔ اور بہت ممنون تھیں۔ ان لوگوں کی بھی جو ان کا ساتھ بھی بڑی ایمانداری اور
 دیانتداری سے دے رہے تھے۔

”میڈم! آج کل یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ کچھ اس نیک کام کے سہارے، پیٹھ پیچھے نہایت گھناؤنا کام کرتے ہیں۔ ابھی
 پچھلے ہفتے ہی لے لیجیے، پولیس فورس نے رستے ہاتھوں ایک گروپ کو اریسٹ کیا ہے، جو اس نیک کام کو سہارا بنا کر اسمگلنگ

جیسی غلط حرکتوں میں ملوث رہے ہیں۔" ایک صحافی نے طنز یہ لہجے میں کہا تھا۔
 "تو آپ کا کیا خیال ہے میں یہاں یہ کام کرنے آئی ہوں؟" انہوں نے جرنلسٹ کی بات کا ٹیپھی۔ انہیں اس صحافی کا لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔

"ارے نہیں میڈم! آپ تو شاید برا مان گئی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ نے ایک لیڈی ہو کر اتنا مشکل پروفیشن چوز کیا ہے، تو آپ کو تو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اب کے صحافی نے ذرا سنجیدگی کر کہا تھا۔
 "جہلی بات تو یہ کہ میں اکیلی بالکل نہیں ہوں، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری بیک سپورٹ نہایت مضبوط اور اونسٹ ہیں۔ جن کی وجہ سے میں نے یہ پروفیشن چوز کیا ہے، ورنہ میں یہ جانتی ہوں کہ اس معاشرے میں ایک اکیلی عورت، چاہے وہ کوئی سادھی پروفیشن کیوں نہ ہو، اس میں اگر وہ انوالو ہے تو وہ اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ کی بیک باورٹل ہو، ورنہ جگہ جگہ منہ بھاڑے بڑے بڑے خونخوار مگر چھتہ تاک میں رہے ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور کب وہ اکیلی عورت کو ثابت سالم ہی لگھ جائیں۔ اور وہ سب میری راہ میں آنے والی مشکلات، تو میں انہیں سینڈل کرنا جانتی ہوں۔ اور جن مشکلات کی آپ بات کر رہے ہیں۔ میں انہیں بھی بتوئی سمجھتی ہوں۔ اس لیے پلیز، میری آپ میڈیا سے ایک ریکویسٹ یہ بھی ہے کہ جب تک آپ خود سے کچھ معلوم نہ کریں کہ حقیقت کیا ہے؟ کوئی سانحہ ہو جاتا ہے تو اس کا پس منظر کیا ہے، تو پلیز اسے اخباروں کی سرخیاں مت بنایا کیجیے، ویسے بھی اسکیڈنڈرینا نے میں تو آپ لوگوں کو مہارت حاصل ہے۔" سزننا میہ یوسف نے سائے بیٹھے بہت سے صحافیوں پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی تھی۔ اسی طرح انہوں نے ہر صحافی کے کیے گئے سوالوں کے نہایت خوش اسلوبی سے جوابات دیے تھے۔ یہ سلسلہ رات کے تقریباً ڈھائی بجے اپنے اختتام پذیر ہوا تھا۔

گھڑی کے بڑے کانٹے نے رات کے تین بجے کا الارم دے دیا تھا۔ گھڑی کی تک تک کے ساتھ بی بی جان کی بھی دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت بنگلے کے مین گیٹ پر مشکاکہ کی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی تھی۔ گاڑی پورچ میں پارک کر کے وہ باہر نکل آئی تھی۔ اور جھوٹی جھامٹی اندر داخل ہو رہی تھی۔ بی بی جان دوڑ کر اس کے پاس پہنچی تھیں اور اسے سہارے سے لاؤنچ میں رکھے صوفے پر آرام سے بٹھا دیا تھا۔ اور خود بھی اس کے نزدیک بیٹھ گئی تھیں۔

"مشکاکہ بیٹا! اتنی رات کہاں تھیں آپ؟" صوفے کی بیک پر سر رکھتے آنکھیں بند کیے مشکاکہ کا وہ سر سہلا رہی تھیں۔

"ارے کہاں بی بی جان! ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔" وہ ڈگمگاتی ہوئی کھڑی ہوئی تھی۔ لفظوں میں بے پناہ لڑکھڑاہٹ تھی۔ بی بی جان بھی اس کے ساتھ ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"یہ بتائیے کھانا کھایا آپ نے؟" ان کے لہجے میں اس کے لیے نہایت فکر مندی تھی۔

"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ انہیں چھوڑ کر لڑکھڑاتی ہوئی اوپر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تھی، کہ میٹرٹی کے پاس رکھا کورنر پر سجا رنگ برنگے بھولوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ لگنے سے زمین بوس ہو گیا تھا۔ جس کی آواز اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ جس کی مشکاکہ کو قطعاً پرواہ نہ تھی، کیونکہ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ ہر روز گھر دیر سے آتا، کچھ نہ کچھ توڑ دینا، اسے کوئی فکر نہیں تھی، کیونکہ اس نولے ہوئے کالج کی کرسیوں کی مانند وہ بھی اندر سے کچی کچی ہی تھی۔ اس کے آج کے شور کی وجہ سے سزننا میہ یوسف کمرے سے برآمد ہوئی تھیں۔

"یہ کیسا شور ہے؟" انہوں نے ایک ناگوار نظر اوپر جاتی مشکاکہ پر ڈالی تھی۔

"آپ جانتی ہیں بی بی جان! کہ میں سلپنگ پلو لے کر سوئی ہوں۔ ابھی ابھی آنکھ لگی تھی۔"

"وہ بیٹم صلابہ! مجھ سے گلدان ٹوٹ گیا دھوکے سے۔" شرمندگی سے کہتے ہوئے انہوں نے یہ الزام اپنے سر لیا تھا۔

”نو، نو، ما“ جاتی ہوئی مشکاؤہ جبرے سے ٹپٹی تھی۔ ”یہ گلدان مجھ سے نوتا ہے، مشکاؤہ یوسف سے، بی بی جان سے نہیں۔“ وہ ایک اسٹیپ پیچھے اترتی تھی۔

”ایڈ آئی ایم سوری، درحقیقت میں یہ بھول گئی تھی کہ ہائی سوسائٹی کی اتنی مشہور معروف ترین شہل و کر اپنے روم میں ریست کر رہی ہیں۔ جن کا سارا وقت قیم و سٹین بچوں کی مدد کرتے، اسٹیج پر تقریریں کرتے گزرتا ہے۔ اور مشکاؤہ یوسف نے ان کی غینہ سبب کر دی۔ چاہے اچھا“ وہ اس وقت بالکل بھی اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ اسے گہری نیند کی اشد ضرورت ہے۔ وہ واپس اوپر جانے کے لیے ٹپٹی تھی۔

”مشکاؤہ یوسف خان! بری بات آپ کو ایسا کرنا چاہیے تھا۔“ وہ اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگی تھی۔

”ہونہ بد قیڑا“ مسز نامیہ یوسف اس کی پشت کو گھورتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں جا بند ہوئی تھیں۔ اور بی بی جان ہر روز کی طرح مزیک پر بکھرے کالج کے ٹکڑے سینے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

”بی بی جان! ناشتہ، بی بی جان! ناشتہ۔“ وہ بچوں کی طرح چمچے اور کانٹے سے پٹیں بجا رہی تھی۔ اور اس کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا، جب تک بی بی جان اس کا ناشتہ اس کے آگے ٹیبل پر نہ رکھ دیتیں تھیں۔

”یہ تو تمہارا ناشتہ تیار ہے۔“ ناشتہ کی ٹرے اس کے آگے رکھ کر، اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئیں۔ اور بڑے پیار سے اسے ناشتہ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

صورہ بی بی مسز نامیہ یوسف کے ساتھ جہیز میں ہی آئی تھیں۔ بہت جوانی میں ہی انہوں نے بیوگی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ مہک اور مشکاؤہ کو انہوں نے ہی اپنی گود میں کھلا پلا کر بڑا کیا تھا، لیکن مشکاؤہ کو وہ سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں، بہت چاہتی تھیں اسے کیونکہ وہ بچپن سے اب تک محرومی کا ہی شکار رہی تھی۔ یوسف خان، مشکاؤہ کو بہت چھوٹی سی عمر میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ بالکل تنہا واکیلی رہ گئی تھی۔ جسے بی بی جان نے اپنی نرم و گرم آغوش میں بھر لیا تھا۔ اور بی بی جان کے بعد اگر اس کی تنہا زندگی کا سانس بنا تھا وہ تھا ملحق موسیٰ۔“

☆ ☆ ☆

”ہینڈز اپ۔“ اچانک ہی کلب میں پولیس فورس کو دیکھ کر سب کے ہی چہرے فق ہو گئے تھے۔ پولیس نے سب کو اس طرح گھیرا تھا کہ کوئی بھی اپنی جگہ سے مل نہیں سکتا تھا۔ انسپٹر نے سب کو باری باری ایک نظر دیکھا تھا۔ اور پھر اپنے پر عجب لہجے میں بولا تھا۔

”سب کو ریٹ کر لو۔“ وہ کہہ کر جانے لگا تھا۔

”لیکن ہمارا قصور کیا ہے؟“ اس کا رنگ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ وہ آنے والی آواز کی سمت آیا تھا۔

”سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ آپ یہاں موجود ہیں۔“ اس کی خوفزدہ آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔ ایک لمحے کو تو مشکاؤہ شپٹا کر رہ گئی تھی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”اس کلب میں گیمز کے بہانے ہیروئن کی اسمگلنگ ہوتی ہے۔ یہاں ڈرگز و منشیات کا کاروبار کیا جاتا ہے۔“

”تو آپ کا مطلب ہے، ہم کرتے ہیں یہ کام۔“ پولیس اسٹیشن جانے کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ اسے اپنی نہیں بلکہ اپنی ماما کی فکر تھی۔ اگر میڈیا کو ذرا سی بھٹک پڑی کہ مسز نامیہ یوسف کی چھوٹی صاحبزادی مشکاؤہ یوسف کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے، تو اخبار میں اس خبر کو خوب مصالحہ لگا کر اخباروں کی ہیڈ لائن میں سرعام کریں گے، جس سے مخالف پارٹی مسز

نامیہ یوسف کا خوب مذاق بنائے گی، جو کہ مشکا کا قلعی گوارہ نہیں ہوگا۔
 ”مجھے سوال و جواب سننے کی عادت نہیں ہے۔ لے چلیں سب کو۔“ وہ کسی کی بھی کچھ سے بغیر، غصے سے کہتا ہوا ہر کھل گیا تھا۔

”آف یار! کیا غضب کی پر سنائی ہے۔ ہاں لکھن انکس فلم کا ہیرو لگتا ہے۔“ ماریہ اس کے قصیدے سے پڑھنے لگی تھی۔

”میرا تو اس انسپکٹر پر زبردست قسم کا دل آ گیا ہے۔“ اس نے اپنے پائیں جانب سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی سانس خارج کی تھی۔ ”قسم سے، یہ مجھے اپنا ساتھ دے دے تو میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دوں۔ دیکھ تو ایک نظر، دیکھئے تک کارو اور انکس ہے غلام۔“ ماریہ کو یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ غلطی سے بھی اس طرف اپنا رخ نہیں کر رہا ہے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یار! چیز ہے، بندے میں بات ہے۔ لیکن کافی مغرور ہے۔“ لیلیٰ نے بھی ماریہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

”تم لوگوں کو شرم تو آتی نہیں۔ اتنے فضول سے شخص کی تعریف کر رہی ہو۔ جس نے ہمیں بنا کسی ثبوت کے ہی اندر کر دیا ہے۔“ مشکا کا ان دونوں کے منہ سے اس انسپکٹر کی تعریف سن کر چپ کر بولی تھی۔

”ارے یہ چاہے نا تو میں ساری عمر اندر جیل میں ہی رہوں، مگر ساتھ یہ ہیرو بھی ہو تو۔“ ماریہ نے فائل پر جھٹکے انسپکٹر کو پیار بھری نظر سے دیکھنے کے بعد، لیلیٰ کو شرارت سے آنکھ ماری تھی۔

”اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس انسپکٹر سمیت تم دونوں کو پچھائی پر لٹکا دوں۔“ وہ مزج ہو کر وہاں سے ہٹ کر چیخے اور لوگوں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی، جو کہ گرمی کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے چہرے کے سپین کو خشک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سب میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جس کی بیک مضبوط نہ ہو۔ کوئی سائنسدان کا بھانجا، تو کوئی کسی کمشنر کا بیٹا، کوئی کسی اونچی حقیقت سے تھا، تو کسی کے تعلقات بہت دور دور تک تھے، ہر کوئی اپنی الگ الگ سپورٹ رکھتا تھا۔ دو گھنٹے ہو گئے تھے ان لوگوں کو جیل میں قید ہوئے۔

”سرسراؤ کے سر!“ وہ فون پر باتیں کر رہا تھا کسی سے، لیکن ان لوگوں تک صرف یہی چند لفظ پہنچے تھے۔ فون رکھنے کے بعد انسپکٹر نے حوالدار کو پکارا تھا جو کہ فوراً چلا آیا تھا۔

”ہاں تو دین محمد! ان سب کو چھوڑ دو، کیونکہ اب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چیئر سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ چہرے کے تناؤ سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کافی غصے میں ہے۔

”بائے غلام! ایک پیار بھری نظر ہی ڈال جاتے۔“ ماریہ کو سخت افسوس ہوا کہ وہ اسے دیکھے بنا ہی چلا گیا تھا۔

☆☆☆

مشکا، ماریہ اور لیلیٰ آپس میں کلوز فرینڈز تھیں۔ اور یہ دوستی بھی مشکا نے ملہوق کے باہر جانے کے بعد ہی کی تھی۔ اس وقت بھی وہ تینوں ایک ساتھ سیکڑ و ہلڈز میں بیٹھیں، برگر اور پیپسی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، جسمی لیلیٰ کے موبائل کی سپ بلی تھی۔ جسے سن کر وہ ان دونوں کو بائے کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی، جبکہ وہ دونوں وہاں اکیلی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

”مشکا! تیرا کزن کب آ رہا ہے؟“ ماریہ نے بیٹی کا ایک سپ لیا تھا۔

”ابھی کہاں یار! ابھی تو نجانے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔“ ہاتھ میں پکڑا آدھا برگر اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

”تجھ سے زیادہ تو مجھے اس کا انتظار ہونے لگا ہے۔“

”اے خبردار! جو ملہوق پر بری نیت ڈالی تو قتل کر دوں گی۔“ مشکا نے نیبل پر رکھنا نازک سا شیشے کا گلاس اٹھایا تھا۔

”میری تو عادت ہے جہاں حسین لڑکا دیکھا فوراً پھسل گئی۔“ اس کی بات پر ماریہ کھلمکھلا گرجنے پڑی تھی۔
 ”اوہ ہوا بڑی خوش تھی ہے کہ وہ حسین ہے۔“ ماریہ اسے چرانے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مشکا کا کی جان بندوق میں ہے،
 جس کی وہ کسی سے بھی برائی نہیں سن سکتی تھی، یہ تو ماریہ تھی، جس سے وہ ہر طرح کا مذاق کر لیا کرتی تھی۔
 ”مانسڈاٹ، وہ ہے ہی سب سے حسین۔“ مشکا نے سمجھتی تھی کہ وہ اسے مکمل چرانے کے موڈ میں ہے۔ اس لیے مسکراتے
 ہوئے ہاتھ میں پکڑا گلا واپس بھیل پر رکھ دیا تھا۔
 ”کیا خیال ہے چلیں؟“ وہ دونوں ساتھ باہر نکلی تھیں۔
 ”کہاں چلا گیا؟“ ماریہ اپنے پرس میں کچھ کھنگال رہی تھی، جو کہ پاس کھڑی مشکا سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا۔
 ”تو باز نہیں آئے گی نا؟“

”ارے یارا اس کے بغیر اب سکون بھی تو نہیں ملتا ہے۔“ آخر کار اس کی کوشش کا میاب ہو گئی تھی اور اپنی مطلوبہ شے برآمد
 کر لی تھی۔ اور ہاتھ میں پکڑے وہ دونوں گاڑی میں آ بیٹھی تھیں۔ گاڑی ڈرائیو کرنے سے پہلے ہی ماریہ نے اپنا کام سرانجام
 دے دیا تھا۔
 ”اے اللہ ماریہ اتنی اذیت۔“ ماریہ نے بائیں ہاتھ کی آستینیں اوپر کیں اور بڑی بے دردی سے اپنے بازو پر سرخ گناؤں
 دی تھی۔ مشکا نے اس کی تکلیف اپنے آپ میں پوری طرح محسوس کی تھی۔
 بے وقوف اس اذیت میں بھی اپنا الگ ہی مزہ ہے۔ اپنے دل کے درد، اپنے غموں سے چھٹکارا پانے کا ایک یہی حل
 ہے۔“ اس نے مشکا کو بھی آخر کی جتنے مشکا نے منع کر دیا تھا۔
 ”اچھا چھوڑو تم یہ سب۔ اور مجھے خالہ جان کے گھر ڈراپ کر دو۔“ ماریہ نے اسے مسز سامیہ موسیٰ کے گھر ڈراپ کر دیا تھا
 اور خود اپنے گھر کی راہ لی تھی۔

☆☆☆☆

”مشکا؟“ ماریہ کوئی چوتھی بار اس کو پکار رہی تھی، مگر وہ ہنوز اسی انداز میں بیٹھی تھی۔ اب کے اس نے مشکا کے ہاتھ پہ
 ہاتھ رکھ دیا تھا۔
 ”مشکا؟“ وہ کسی خیال سے چوکی تھی۔ اور اسے دیکھنے لگی تھی۔
 ”کیا بات ہے؟ اتنی اداس و دیران کیوں ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔
 ”کچھ نہیں۔“ کچھ دیر خاموشی کا راج ایک باز پھر رہا تھا۔
 ”مشکا؟ آریو آئل رائٹ؟“ ماریہ کو اس کی جامد خاموشی بہت محسوس ہوئی تھی۔
 ”ماریہ! مجھے وہ سرخ چاہیے۔“
 ”واٹ؟“ اس کا شاک ہونا سہا تھا۔

”ہاں ماریہ! مجھے وہ چاہیے۔ اور تم ہی نے تو کہا تھا کہ اسے لگا کر بندہ ہرغم، ہر دکھ بھول جاتا ہے۔“ وہ ابھی تک ماما اور مہک
 کی باتوں کے زیر اثر تھی۔

”بٹ میری جان! تمہیں کون سا غم لگ گیا؟“ ماریہ کے پوچھنے پر مشکا نے مسز نامیہ یوسف اور مہک کے مابین ہونے
 والی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔

”تو یہ تھی تمہاری خاموشی کی وجہ۔“ ماریہ کو بھی بہت دکھ پہنچا تھا یہ نہ کر۔
 ”اوہ، تم میرے ساتھ چلو۔“ وہ اسے لے کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ گھر کے گیراج میں گاڑی پارک کرتے ہوئے بولی

تھی۔ "فی الحال تم میرے کمرے میں کچھ دیر بیٹھ کر رہو۔ پھر بات کرتے ہیں۔" وہ اسے لیے اندر پہلی آئی تھی۔ اور پھر ہمیں سے مشکاکہ کو اپنا ہر دکھ، ہر درد، غم، پانی پر لکھی تحریر کی طرح نکلنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

کتنا خوش تھی وہ آج۔ کوئی دیکھے تو یہ ہی کہے کہ، "گلتا ہے مشکاکہ یوسف کو آج قارون کے خزانے کی خبر مل گئی ہو۔" مگر اس کے لیے اس خبر سے زیادہ وہ خوشی زیادہ معنی رکھتی تھی، خالہ جان کے گھر آکر اسے یہ پتہ چلا تھا کہ سلوک ٹھیک ایک سال بعد آ رہا ہے۔ اس خبر سے اس کے قدم زمین پر نکلنے سے انکاری تھے۔ وہ خود کو ہواؤں کی جھولیوں میں جھومتا محسوس کر رہی تھی۔ اپنی اس خوشی کو وہ بی بی جان کے علاوہ کسی اور سے شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی، کہ سلوک موسیٰ بہت جلد آنے والا ہے۔ اب ان کی جدائی، ان کے درمیان کا فاصلہ ختم ہونے والا ہے۔ وہ اپنی اس خوشی کو بی بی جان سے اندر شیئر کرنے جا رہی تھی۔ لاؤنج سے آئی مسز نامیہ یوسف اور مہک کی آوازوں پر دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔

"بٹ ماما! سلوک ایئر پورٹ پر مشکاکہ کو بھی دیکھنا چاہیے گا نا۔"

"مائی چائلڈ! اسے کیا معلوم کہ سلوک کب آ رہے ہیں؟" ان کا لہجہ عجیب ہی انداز لیے ہوا تھا۔

"اور اگر حالہ جانی نے مشکاکہ کو بتا دیا تو؟"

"وہ تو ہے ہی بے وقوف، اتنا منع کرتی ہوں کہ مشکاکہ سے سلوک کی کوئی بات نہ کیا کرے۔ اور ویسے میرا خیال ہے کہ ابھی مشکاکہ کو اس بات کی خبر نہیں ہوئی ہوگی۔"

"مما! ویسے کچھ غلطی آپ کی بھی ہے۔ نہ آپ اسے بچپن سے وہاں بھیجتیں، نہ یہ دن دیکھنے پڑتے۔" مہک کا شکایتی انداز تھا۔

"لیس سویٹ ہارٹ! اس غلطی کا تو مجھے اعتراف ہے۔ مگر اب میں ایسا آگے کچھ بھی نہیں ہونے دوں گی۔ اس کی ماں کو تو میں نے برداشت کر لیا تھا، لیکن اسے میں تمہارے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔" ان کے لب و لہجے میں اتنی نفرت اور یہ انکشاف، مشکاکہ کے دل کو زبردست دھچکا لگا تھا، گرد و پوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو یقیناً وہ زمین یوس ہو چکی ہوتی۔ تو نامیہ بیگم اس کی سوتیلی ماں اور مہک اس کی سوتیلی بہن تھی۔

"سلوک آئے تو ہر جگہ اس کے ساتھ تمہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ سلوک کے خوابوں و خیالوں میں بھی صرف آپ کا قصور ہو۔" انہوں نے بڑے پیار سے اس کے گال چھوئے تھے۔

"لیکن ماما! سلوک کے روم روم میں تو صرف مشکاکہ ہی ہے۔ اس کے آنے والے ہر خط میں اس کا ذکر، ہر فن پر اس کا تذکرہ، آخر ہم کب تک سلوک سے چھپائیں گے کہ وہ کوئی کمپیوٹر کورس کرنے دوسرے شہر نہیں گئی ہے، بلکہ یہیں پر ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔" مہک کے لہجے میں بھرپور افسردگی جھلک رہی تھی۔

"جب کی جب دیکھی جائے گی۔ فی الحال آپ اپنے اور سلوک کے بارے میں سوچیے۔ اور ابھی سے پلاننگ بنا لیجیے کہ آپ کو سلوک کو کہاں کہاں لے جانا ہے۔ بس میں آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور رہے مشکاکہ تو اس کو لے کر آپ کو ٹینشن لینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آپ دونوں کے بیچ کی دیوار بالکل نہیں بنے گی۔ بالفرض اگر اس نے ایسی کوئی کوشش بھی کی تو وہ حال کروں گی تا عمر یاد رکھے گی۔" کتنا بغض، کتنی نفرت، کیڑہ تھان دونوں ماں بیٹی کے دل میں۔ مسز نامیہ یوسف کا یہ دوسرا روپ گر میڈیا کی نظروں میں آجائے، تو وہ انہیں دیکھنا بھی پسند نہ کرے، اور عوام ان کے لبوں پر تو یہی الفاظ ہوں گے، جو عورت اپنے گھر میں رہنے والی یتیم و مسکین اور سوتیلی بیٹی کے ساتھ انصاف نہ کر سکی، وہ عورتوں کے حقوق کے لیے کیا لڑے گی۔" مشکاکہ کے کانوں میں ان دونوں کے زور سے قہقہوں کی آواز گونجی تو وہ جیسے حال میں لوٹی

تھی۔ نہایت آہستگی سے وہ وہاں سے ہٹتی تھی اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ بیل پر گڑ گڑو گھنچوں سے رو دی تھی۔

انسان اپنی ہی نظروں میں خود گر جائے تو اس کے لیے کوئی چارہ مہر کی نہیں۔ وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ خوف تھا کہ آواز پاہر نہ چلی جائے۔ بڑی دیر اس نے اپنے اندر کی وحشت پر نو حد کیا تھا۔ دیر تک اپنی حماقت پر ماتم کیا تھا۔ جب اس کا ذہن گہری غیبت میں ڈوب رہا تھا، تو آخری سوچ یہ تھی۔ ”بعض لوگ اپنا مقصد پانے کے لیے کتنی محنت کرتے ہیں۔ چاہے دوسروں کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ جس کی انہیں مطلق پروا نہیں اور۔۔۔ اور وہ اب اس کا تصور بھی اپنے ذہن میں نہیں لائے گی، جو کہ بہت مشکل ہے۔“

صبح دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو رات کا سارا منظر، ساری باتیں ایک بار پھر اسے پریشان کرنے لگی تھیں۔ اس کی خوشی و غم کا محور تو صرف سلوک تھا۔ اس کی پہلی خوشی آخری تنہا تو وہی ہے، تو کیا مہما سے بھی مجھ سے پھین لیں گی۔ پھین کے وہ تمام مناظر ان آنکھوں میں بھرنے لگے تھے، جب اس کے ساتھ ہمیشہ نا انصافیاں ہوتی تھیں، مہمک کو اتنی اہمیت دی جاتی تھی اور مجھے اگتور، وہ شے جو میری پسندیدہ تھی، وہی مہمک کی بھی، یعنی یہ سب اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب مجھے نیچا دکھانے کے طریقے تھے، کیونکہ میں سوتیلی جو بیٹھری۔ پھر تو سلوک سے واقعی میرا کوئی رشتہ نہ ہوا۔ میرا تو کوئی حق نہیں جتا اس پر۔“ اس نے سوچوں کی یلغار میں خود کو اتنا گم کر لیا کہ اب زندگی صرف موت مانگنے لگی تھی۔ اور ایسا ہی کیا تھا اس نے، اندر ہی اندر اپنے آپ کو اذیت دینے لگی تھی وہ، تاکہ وہ ان ساری نا انصافیوں کو بھلانے میں کامیاب ہو سکے، جو شاید ممکن نہیں۔

☆☆☆

سلوک موہی نے جیسے ہی اپنی سرزمین پر قدم رکھا تو سب سے پہلے اپنے وطن کی سوندری سوندری خوشبو اپنی سانسوں میں شامل کی۔ اور سب سے ملنے کی خوشی میں آگے قدم بڑھانے لگا تھا۔ سامنے ہی مسز نامیہ، مہمک اور ماما جانی اور بابا جانی کو اس کے انتظار میں کھڑا پایا تھا۔ سلوک موہی آج پانچ سال بعد لندن سے ایم بی اے کر کے لوٹا تھا۔ اس کی بے تاب نظریں کسی شناسا چہرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ جس سے وہ یقین آج سے پانچ سال پہلے ملنے کا وعدہ کر گیا تھا۔ مسز نامیہ یوسف نے اس کی حرکت بھانپ لی تھی۔ آخر کار وہ پوچھ ہی بیٹھا تھا۔

”آئی بدشکا؟ نہیں آئی؟“

”ہیٹا! میں نے تو کہا تھا بدشکا؟ کو۔ پر وہ کہنے لگی کہ اسے کوئی ضروری کام ہے۔ اس لیے نہیں چل سکتی۔“ بڑی چالاکی سے انہوں نے یہ سفید جھوٹ بولا تھا، جس پر سلوک بیٹنی بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا انہیں نکلنے لگا تھا۔

”مجھ سے زیادہ بدشکا؟ کو اپنے کام سے لگاؤ ہے۔ یعنی میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔“ وہ دل ہی دل میں بولنے لگا تھا۔ سلوک کو اچانک ہی غصہ آنے لگا تھا بدشکا؟ پر۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی غصہ ہے۔ اسے سامنے پاتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ سارے راستے مہمک ہی اس سے پٹر پٹر بولے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ میڑھیاں پھانکتی آس پاس سے بے نیاز لاؤنج میں بیٹھی، مسز نامیہ یوسف کے آگے آکھڑی ہوئی تھی۔

”ماما! مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔“ وہ ہاتھ میں جھلائی کچن اور منہ میں چباتی چیونٹم سیٹ بولی تھی، یہ دیکھتے بغیر کہ کوئی سامنے بیٹھا بڑی فرمت سے اسے تک رہا ہے۔

”لیکن ایک ہفتے پہلے تو آپ کو پانچ ہزار دیے تھے۔“ وہ بدشکا؟ کو دے دیے بیویوں کا بہت حساب رکھتی تھیں۔

”ماما! ایک ہفتے پہلے، یعنی کہ سات دن ہو گئے ختم ہو گئے، مجھے اور چاہئیں۔“ اس نے بات کا نٹے ہوئے بدتمیزی سے کہا

تھا۔

”مشکا! کوئی تیز ہے تمہیں۔ کوئی مہمان آئے بیٹھے ہیں۔“ مہک کی برداشت سے اس کی بدتمیزیاں باہر تھیں، جو وہ ایک سال سے کرتی چلی آ رہی تھی۔

”تو کیا میرے مہمان آئے بیٹھے ہیں؟“ وہ اس کے چہ ہوئے لہجے سے چپ کر بولی تھی۔ لیکن نظر ابھی بھی اس شخصیت پر نہیں پڑی تھی، جو ابھی بھی بڑی بے تاب نظروں سے اسے ٹکاتا جا رہا تھا۔

”مشکا! کیوں لڑنے والی باتیں کر رہی ہو؟“ مسز نامیہ یوسف نے نوکا کا تھا۔

”میں لڑ رہی ہوں، یا پھر یہ محترمہ لڑ رہی ہیں۔“ مشکا کے لہجے میں اتنا غصہ، وہ حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ بل ہی بل میں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ مشکا یوسف کا یہ روپ۔

”مما! پائیز آپ دے دیں اسے۔ جتنے پیسے مانگ رہی ہے۔ اڑائے گی نا اپنے ہی جیسے بدتمیز و بداخلاق دوستوں میں۔“

”چلیے سلوک! ہم شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔“ مہک کہہ کر سامنے بیٹھے سلوک کی سمت مڑی تھی، جس کی نظریں ابھی بھی مشکا کے چہرے کا ہی طواف کر رہی تھیں۔ لیکن ان نظروں میں اب حیرانگی کا قبضہ تھا۔ مشکا، مہک کی بات کا جواب دیتی کہ اس کے آخری بیٹے پر جھٹکے سے مڑی تھی۔ سامنے بیٹھے دشمن جاں سے نظریں ملیں تو جھپکنا ہی بھول گئی تھیں۔

”چلیے مشکا! میں آپ کو پیسے دے دوں۔“ مسز نامیہ یوسف سے کہاں برداشت تھا یہ سب، اس لیے فوراً سے پیشتر اسے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

☆☆☆

”اتنا دکھ، اتنا کرب آخر اس کی آنکھوں میں ایسا کیا دکھ ہے، جسے وہ بہت چھپانے کے باوجود چھپا نہ سکی۔“ وہ اپنے کمرے میں تباہ بیٹھا اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور اپنی ان سوچوں کو وہ جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا مزید الجھتا چلا جا رہا تھا۔

”مشکا! میں تو تمہاری متاعِ حیات، کل کائنات تھا، تمہاری تو ہر خوشی، ہر غم کی کڑیاں مجھ سے ہی آکر ملتی تھیں۔ تمہارا تو سہارا ہی میں تھا۔ پھر دوسرا کون سا سہارا تلاش کر لیا مشکا! تم نے کہ اب میری ضرورت تک محسوس نہ ہوئی تمہیں؟ میں تو سمجھا تھا کہ ان پانچ سال میں کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔ سب ویسا ہی ہوگا جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔ تم مجھ سے اسی بے تکلفی سے آکر گلے لگو گی، جیسے ہم پہلے ملتے تھے۔ مگر یہ کیا؟ یہ ہمارے درمیان تکلف کی دیوار کیوں کھڑی ہو گئی، ان پانچ سالوں میں؟ نہ تو تم نے میرے کسی خط کا جواب دیا اور نہ ہی ای سیل، جو کہ صرف تمہاری ہی فرمائش پہ میں اپنی بہت مصروفیت سے وقت نکال کر تمہیں خط لکھتا تھا۔ پانچ سال کی جدائی نے تمہیں اس قدر بدل دیا کہ آج ایک ہفتے بعد ہی ہو۔ تو وہ بھی اتنی بیگانگی، اتنی انہیت لیے۔“ وہ پریشان سا ادھر ادھر ٹپٹپٹے لگا تھا۔ آخر کار تھک ہار کر وہ کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ اور گزشتہ دنوں کو یاد کرنے لگا تھا۔

یوسف خان کے انتقال کے بعد مشکا کا سامنے بچپن سے لے کر جوانی تک سلوک ہی رہا تھا۔ اس کی چھوٹی معصوم خواہشیں اور فرمائشیں سلوک ہی پوری کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مشکا کو کبھی اپنے ساتھ لندن لے کر جائے گا۔ جس کی اس نے ہاں بھری تھی، لیکن قسمت کو یہ منظور ہی نہ تھا، اس لیے سلوک کو اکیلے جانا پڑا تھا۔

”مشکا! میں جا رہا ہوں۔ ٹھیک پانچ سال بعد لوٹوں گا۔ اور تم اس وقت بھی مجھے یہیں ملو گی۔ یو لو ونگی نا؟“ وہ ایئر پورٹ پر کھڑے ایک دوسرے سے وعدے لے رہے تھے، جس پر مشکا نے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔ سلوک اس کو آخری بار

بیار سے کچھ لگا تا ہوا اسے تھاکر گیا تھا۔ جس پر مشکا کو بی بی جان کی ہی آغوش میں سر تھی۔
 ”اور آج تو اتنی بے نیازی، اتنی بیگانی کیوں؟“ مشکا نے اس کا لطف کیوں؟

مشکا نے اتنا ہی ذات تو میرے گرد گھومتی تھی نا۔ پھر تم اتنا بدل کیسے کر گئیں؟“ یہ سب اس جان جان سے آج ملاقات کا اثر تھا۔ وہ مزید پیش میں گھر گیا تھا۔ پیش کو زائل کرنے کے لیے آکر بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں تھیں۔
 ”میں کیا کرتی تھی؟“ اس میں مجبور تھی۔ ایم سو ری تھی کہ ”اگر وہاں وہ بے سکون تھا تو جین مشکا کو بھی نہیں تھا۔ یہاں یہ بھی پانی سے نکلی پھٹی کی طرح تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی۔ لیکن یہ سب اس وقت بھولنے کے لیے اس کے پاس ملا تھا۔ کچھ وقت کے لیے وہ یہ سب نظر انداز کرنے کا حل جانتی تھی۔ اپنے بیڈ روم کے دروازے کو لاک کیا اور اپنے براؤن پرس سے سرخ نکالی۔ دوپٹہ ایک طرف پھینکا۔ آستین اوپر کی اور بازو پر لگالی۔ پانچ دس منٹ بعد وہ سارے عالم سے بے خبر، غنودگی میں، گہری نیند میں ڈوٹی چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اے مشکا! وہ آگیا ہے۔“ ماریہ آج بہت ترنگ میں تھی۔

”کون بھی؟“ مشکا نے بدلے بدل کھاتی ہلکی نے پوچھا تھا، جبکہ مشکا کی سوالیہ نظریں بھی ماریہ پر تکی تھیں۔

”ارے وہی انڈیو انسپلر، بیج یار! اتنا ڈینشنگ لگ رہا تھا۔ میرا تو نہیں خیال کہ روئے زمین پر اس جیسا کوئی اتنا حسین ہوگا۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی، جبکہ وہ دونوں اس حسین کو یاد کرنے کی کوشش میں لگی تھیں۔

”اچھا وہ اسٹوڈنٹ، ایڈیٹ انسپلر۔“ مشکا نے ذہن میں جھٹکے سے وہ منظر گھوما تھا۔

”اور بائے دادے وہ گویا کہاں تھا، جو تجھے اس کے آنے جانے کی اتنی خبر ہے۔“

”اصل میں، میں نے پتہ کروا دیا تھا کہ وہ اسلام آباد کی کس کس کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔“ وہ سر کھجاتی ہوئی بولی تھی۔

”ماریہ! تو اس کو چھوڑ مجھے بتا۔ وہ تجھے کہاں ملا؟“ ہلکی کو جاننے کا شوق ہوا تھا۔

”مئی کی سوشل پارٹی میں۔ قسم سے یار! کیا غضب کی چیز ہے۔ یار! وہ انٹ لٹھے کے ہاتھن کے شلوار کرتے میں، اس کی حسین پر سنائی مزید گھڑی تھی۔“ ماریہ پھر سے شروع ہو گئی تھی، جسے ہلکی بڑے شوق سے اور مشکا قہقہہ ہنسی سے سن رہی تھی۔

”ایک تو میں تیری ان فضول کی بے تکی تعریفوں سے بڑی تنگ ہوں۔ جہاں حسین لڑکا دیکھا وہاں شروع ہو گئی۔ اور اگر تو نے کوئی اور حسین چہرہ دیکھا، تو مجھے از حد یقین ہے کہ پھر وہ ایڈیٹ انسپلر کسی گفتی میں نہیں آئے گا۔“ مشکا نے اسے جھاڑا تھا، جس پر وہ دونوں ہی کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھیں، جس پر کچھ دیر بعد مشکا کو بھی ان دونوں کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

”ویسے مشکا! میرا خیال ہے یہ آخری ہے۔“ اس نے لپٹی ”وہ کچھ کرا کھد ہائی تھی۔“

”یعنی کہ ”خیال“ اومانی گاڈ ماریہ! تیرا تو اللہ ہی حافظ ہے۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں تھا ہالیک پرس اس کے بازو پر دے مارا تھا۔ جس پر مٹیوں کے تھقبے بند تھے۔

☆ ☆ ☆

ہلک جینز پر ریڈ اینڈ بلو کنٹراسٹ کی ٹی شرٹ میں ملیوس، گھٹے میں گولڈ چین اور انگلی میں چھلا ڈالے، ہاتھ میں کچھین پکڑے وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے یکسر بے نیاز، بے پروا سڑھیاں پھلاکتی چلی آ رہی تھی۔ اور آکر ناشتے کی ٹیبل پر براہمان ہو گئی تھی۔

”بی بی جان! ناشتہ۔ بی بی جان! ناشتہ۔“ ہر روز کی طرح اسے مخصوص اسٹائل میں، کانٹے اور چمچے سے پلیٹیں بچا کر اپنے

انھ جانے کا اعلان کرنا۔ بی بی جان ناشتے کی ٹرے اس کے آگے رکھ کر جا چکی تھیں۔ اس نے توس کا ایک ٹکڑا توڑا اور آملینٹ سے کھانے ہی لگی تھی۔

”اکیلے اکیلے ناشتہ کرو گی۔“ گھمبیر آواز پر اس نے اپنی گردن اٹھائی تھی۔ وہی دشمن جاں، اس کا چین، زندگی، اس کی کل کائنات، جس کو نا چاہتے ہوئے بھی اپنی سوچوں سے نظر انداز کرنا پڑ رہا تھا، جس کا سامنا کرنے کے خوف سے ہی وہ بکھرے لگتی ہے۔ آج اس وقت وہ اپنی پوری آب و تاب، اپنی بھرپور وجاہت و دلکشی سمیت بلیک جینز پر ہاف سلیوز بلیک جزی زیب تن کیے، بڑے بے تکلفانہ انداز میں اس کی سائیڈ والی چیئر پر براجمان ہے۔

”بھول گئیں، ہم ایک ساتھ ناشتہ کیا کرتے تھے۔ اور پہلا قدم میرے ہاتھ سے کھایا کرتی تھیں۔“ وہ اسے ماشی کے جھروکوں میں جھانکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اور پھر کیسے بھول سکتی تھی وہ لمحے، وہ خوبصورت لمبے جب صرف وہی ہمارے درمیان ہوتے تھے۔ ان کی باتیں، ان کی اپنی شرارتیں ہوتی تھیں۔ مگر اب وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ سامنے بیٹھا یہ شخص اس کے نصیب نہیں۔ جسے مشکا نے چار سال کی عمر سے صرف اپنا مانا تھا۔ صرف اسی کے خواب دیکھے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے ہٹ جائے۔ ان بے تاب نظروں سے بہت دور چلی جائے۔ پر نچانے ایسی کون سی مہنگی طاقت نے اسے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا، کہ وہ وہاں سے خود میں ہٹنے کی سکت تک نہ پا رہی تھی۔ اس کی بدلتی کیفیت، زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر کھلوتی پریشان ہو گیا تھا۔

”مشکا!“ سلجوق نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے نازک ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اس کا لمس محسوس کر کے وہ چونک کر اس کی سمت بکھنے لگی تھی۔ کچھ لمحے تو دونوں کو ایک دوسرے کو یک نکل دیکھنے میں ہی گزار گئے تھے۔ مگر یہ سب مسز نامیہ یوسف کہاں دیکھ سکتی تھیں۔ جلدی سے کوئی بھی لمحہ ضائع کیے، انہوں نے مہک کو ان دونوں کے بیچ لاکھڑا کیا تھا۔ مشکا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالتی ہوئی، بغیر ناشتہ کیے، وہاں سے ہٹتی چلی گئی تھی۔ اور جیسے جیسے وہ دور ہوتی جا رہی تھی، سلجوق کو محسوس ہوا اس کی زندگی اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

”مما! مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”آخر کیا کرتی ہیں آپ اتنے پیسوں کا؟ اور یہ آپ کی گلے کی سونے کی چین کہاں ہے؟“ اس کے لہجے میں اتنی شیرینی اتنی محاسن، مگر وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی یہاں موجود ہے، جسے دیکھنے کی نہ تو مشکا نے زحمت کی تھی، اور نہ ہی اس کے پاس اتنی فرصت تھی کہ وہ ایک جھٹک ہی دیکھ لے آنے والوں کو۔

”وہ گر گئی ہے۔“ لا پرواہی میں کہا گیا یہ جملہ مسز نامیہ یوسف کے تن من میں بجلی چھوڑ گیا تھا، جسے انہوں نے بہت مشکوک سے برداشت کیا تھا۔

”اس وقت نہیں ہیں میرے پاس۔“ انہوں نے پہلو بدلا تھا۔

”کیا مطلب نہیں ہیں۔ مجھے نہیں معلوم آپ دیں مجھے پیسے۔ اور ہوں گے کیوں نہیں؟ پاپا اتنی جائیداد چھوڑ گئے ہیں۔ ان پر میرا بھی تو حق ہے۔“ اس کے لب و لہجے میں اتنی نفرت، حد درجہ کڑواہٹ دیکھ کر سامنے بیٹھا شخص چونک سا گیا تھا۔ وہ اس سے پہلی ملاقات میں سمجھ گیا تھا کہ وہ انتہائی بگڑی ہوئی لڑکی ہے۔

”مشکا!“ اس سے پہلے مسز نامیہ یوسف آگے کچھ کہتیں، مہک کی ضبط کی ساری طنائیں ٹوٹ چکی تھیں۔ اور اس نے بڑھ کر مشکا کے رخسار پر اپنی انگلیوں کے نشان ثبت کر دیئے تھے۔ مہک کی تقلید میں ساتھ بیٹھے سلجوق اور علی حسنین بھی کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ؟“ مشکا نے جوابی کارروائی کرنی چاہی تھی۔
 ”مشا؟“ بلوک کو کچھ کر اس کا اٹھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ جسے اس نے بڑی تکلیف سے نیچے کیا تھا۔ اور جھٹکے
 سے مڑی تھی اور اپنا رخ پھر کی سمت کر لیا تھا۔ جاتی ہوئی مشکا کی پشت دیکھنے کے بعد علی حسین نے بلوک کو چونک کر دیکھا
 تھا۔

☆☆☆

”مشا؟ کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟ سب کے ساتھ میرے ساتھ۔ ہم تو ایک دوسرے کے نہایت قریب
 تھے۔ پھر تم کیوں مجھ سے فرار چاہ رہی ہو؟ کیوں میرے سامنے سے کٹر آکر گزر جاتی ہو؟ اور میں صرف تمہیں بے
 بس ہو کر دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔ کیوں کچھ نہ کر پاتا؟ کیوں تمہارے اندر چھپے دکھ کی تحریریں پڑھ پاتا؟ اور تمہارا لہجہ ان میں
 اتنی رعیت، اتنی آواز کہاں سے سکھ لیں مشکا؟ تم نے؟ جو ہونٹ کل پھول جھاڑتے تھے، آج ان میں کانٹے کہاں سے
 آ گئے؟ جو آنکھیں ستاروں سے زیادہ روشنی رکھتی تھیں۔ ان میں اداسی کا ڈیرا کہاں سے آ گیا؟ تمہارا نازک وجود جو سات
 رنگوں سے پردہ بھگیا رہتا تھا، مجھے سامنے پاتے دو سب کہاں گم ہو گیا؟

”مشا؟ کہاں تھو گئی ہو تم؟“ اس نے چیخ کر پشت پر گردن پیچھے کر کے، آنکھیں منوند کر بے بسی سے سوچا تھا۔ اس کی
 پیشانی پر کھڑے بال سبز سامیہ موسیٰ سنوار نے نگلیں تھیں۔ محبت بھرے لہجے پر اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔
 ”ارے ماما جانی آپ؟“ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

”جی جان ماما! میں، لیکن یہ آپ اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ مسکرا کر گویا ہوئی تھیں۔ انہوں نے لاؤنج کی
 لائٹ چلی دیکھی تو آنکھیں تھیں۔

”بس وہ نیند آرہی تھی۔“ اس نے عذر تراشا تھا۔
 ”ہوا میں کتنی ٹھنکی ہو رہی ہے۔ اور آپ ہا کسی گرم کپڑے کے یہاں بیٹھے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ٹھنڈ لگ جائے، تو چلیں
 فوراً کمرے میں بیٹے۔ رات بہت ہو رہی ہے۔ اور جتنی سوچیں رہ گئی ہیں۔ وہ کل تک ملتوی کر دیں۔“ وہ مڑی سے اس کا
 ہاتھ پکڑے، اس کے کمرے میں لے جانے لگی تھیں۔

”اوکے سوٹ ماما جانی! میں جا رہا ہوں۔“ وہ ماں کے متا بھرے ہندو اور پیار بھرے لہجے پر دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔ اور
 ان کے ہاتھ کو چوم کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

”میں جانتی ہوں جان! آپ کیوں آج کل اتنے الجھے الجھے سے ہیں۔ آپ کے ماتھے پر یہ سوچوں کی لکیریں کیا بیان کر
 رہی ہیں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ ورنہ مشکا میری بہو بنے اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی
 خوشی کی بات نہیں، لیکن افسوس تو یہ بھی ہے کہ نہ تو مشکا سے میرا کوئی سگا رشتہ ہے اور نہ آپا مان رہی ہیں۔“ انہوں نے بلوک
 کے کمرے کے بند دروازے کو بغور دیکھا تھا۔

”لیکن میں ایک کوشش اور کر کے دیکھتی ہوں۔ میں آپ کی خوشی آپ کو دینے کی پوری کوشش کروں گی۔“ انہوں نے خود
 سے ایک بار بھر غم کیا تھا۔

☆☆☆

”پلیز خالہ جانی! آپ ماما کو مت بتائیے گا۔“

”ارے بھری جان! تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔“ انہوں نے پیار سے اسے گلے لگایا تھا۔
 ”تھینک یو خالہ جانی! تھینک یو۔“ مشکا نے ان کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

”آپ بہت اچھی ہیں۔“

”اچھی تو آپ بھی بہت ہیں۔“ سمر سامیہ موٹی نے اس کی کشادہ پیشانی پر مہم نگی تھی۔

”اوکے خالہ جانی! اب میں چلوں گی۔“ اسے بے چینی ہوئے لگی تھی۔ نشے کی طلب سے اس کا سر درد سے پھٹا ہوا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ خود کو بے دردی سے ٹوچ ڈالے، کاٹ ڈالے خود کو۔ اور مائیں کہ اسے پیسے نہیں دے رہی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنی تقریر یا ساری ہی مہنگی جیولری اور کچھ قیمتی سامان بیچ چکی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ مجبوراً اسے سمر سامیہ موٹی کے پاس آنا پڑا تھا۔ یہ نشہ چیز ہی ایسا ہوتا ہے کہ بندے کی سوچنے، سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج کر دیتا ہے۔ وہ گاڑی زن سے اس کے سامنے سے لے گئی تھی اور وہ آواز ہی دیتا رہ گیا تھا۔

”لیکن ماما جانی! آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ آخر وہ اتنے پیسوں کا کرے گی کیا؟“ سلجوق نے زور و جہد سے سمر سامیہ بیگم سے اگھوا ہی لیا تھا، کہ مشکا کا ان سے دس ہزار لے کر گئی ہے۔ مشکا کا کی حرکتیں سلجوق کو کئی خشوک و شبہات میں ڈال رہی تھیں۔

”آخر وہ ملتی کیوں نہیں ہے؟ فون کرو تو بی بی جان سے پتا چلتا ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ گھر جاؤ تو آگئی اور مہنگ اس کی طرف دھیان نہیں جانے دیتیں۔ اور وہ خود اسے ہنوز اگنور کر رہی ہے۔ جیسے میرا کوئی وجود نہیں۔ سلجوق کا غصے کے مارے حال برا ہونے لگا تھا۔ آخر وہ بھی کیوں برداشت کرے اس کی بے رحمی؟ نہ تو اب میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچوں گا، جو کہ یقیناً اس سے ہو نہیں سکے گا۔“ سلجوق نے غصے میں خود کو اپنے کمرے میں قید کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کتنے دن ہو گئے تھے سلجوق کا مشکا کا سے سامنا ہوئے۔ وہ چھٹی بار اس کے گھر جاتا وہ ملتی ہی نہیں تھی۔ کتنی بار ملنے کی کوشش کی۔ مگر ہر بار تا کامی کام نہ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس کے موبائل پر کوشٹ کیا تو بڑی نمبر تھا۔ یا پھر آف ہوتا۔ ایسے محسوس ہوجاتا کہ یہ سب اس کے ساتھ جان بوجھ کر کر رہی ہے۔ نجانے ایسی کون سی ایکٹیوٹیوٹیز پال رکھی تھیں اس نے، جو محسوس ہی ہو کر نہیں دے رہی تھیں۔ وہ مکمل طور پر پھینچلا کے رہ گیا تھا۔ اور اسی پھینچلا ہٹ کو منانے کے لیے وہ اپنے دوست علی حسین کو لیے بے محنت سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

اس وقت وہ تینوں اسنوپی کے باہر سہانا موسم انجوائے کر رہی تھیں۔ مشکا کا گاڑی کے بونٹ پر بیٹھی ہاتھ میں تھامے گی کے بھنے دانے بڑی بے تکلفی سے کھا رہی تھی۔ ماریہ اور لیلیٰ بھی اس کے دائیں بائیں کھڑی آس کر کیم سے شغف فرما رہی تھیں۔ اور ساتھ اپنی باتوں پر بلند پار قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ جو کہ آمنے سامنے سے گزرنے والے لوگ ان پر بڑی مہم نگی نظروں سے دیکھ کر گزر جاتے تھے، جس کی ان تینوں کو مطلق پروا نہ تھی۔

بلیو جینز پر ریڈ شرٹ میں ملبوس گاڑی کے بونٹ پر بیٹھی مشکا کا قہقہہ نہایت بلند تھا۔ جس کا ماریہ اور لیلیٰ نے بھرپور ساتھ دیا تھا۔ مشکا کا قہقہے کو اچانک ہی بریک لگا تھا۔ سامنے کھڑی ریڈ کار میں بیٹھے سلجوق پر اس کی نظر بالکل اچانک لگی تھی۔ ماریہ اور لیلیٰ نے اس کی سفید پڑتی رنگت بہت بار کئی سے محسوس کی تھی۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں ان دونوں نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ علی حسین کو دیکھ کر ماریہ کے چہرے کی رنگت سات رنگوں میں نہا گئی تھی، جبکہ لیلیٰ مذکورہ بالا دونوں کو اپنی جانب دیکھنے سے حیران و پریشان ہو گئی تھی۔

”ماریہ! چلو، جلدی چلو یہاں سے۔“ مشکا کا فوراً بونٹ سے اترتی تھی۔ اور جا کر لمحوں میں ڈرامائیجک سیٹ سنبھال لیتی تھی۔ ماریہ اور لیلیٰ کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گاڑی فرمائے بھرنے لگی تھی۔

”اب تمہاری برائی کی وجہ دور ہو گئی ہوگی کہ مشکا اس نے مجھے فراموشی سے کہاں لٹائی ہے۔“ علی حسنین نے ہنسنے لگا
میں جانتا ہوں کہ تم کو یاد ہوا تھا۔ جس کی نظریں ابھی اسی جگہ پر لگی تھیں۔ وہ تو میرا ہی رہ گیا تھا۔ مشکا کا چہرہ کیا انداز اس
سے غم کی بات ہو رہا تھا۔ جب سے وہ وہاں آیا تھا، ہر بار کی ملاقات میں مشکا کا ہے میرا دلچسپانہ کہانی کی۔ ہر بار
اس کا ایک نیا روپ، نیا انداز دیکھنے کو ملتا تھا۔
”خیر، نہ تو مشکا کا“ وہ دھو سے لڑا تھا۔

شدید کبریٰ ہند سے موسم بہار سرد ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑا اور دروازہ دھکیل کر اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ سامنے جیسے شخص پر نظر پڑتے ہی اس کی رحمت جلدی کی طرح زور پڑ گئی۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا، جیسے اسے پہچان رہا ہو۔ وہ وہاں بیٹھے کھینچنے لگی تھی۔

"مہکا پا!" علی حسنین کی نظروں کی تعاقب میں سلجوق نے دیکھا تھا، تو وہ وقت ضائع کیے بغیر اس تک پہنچا تھا۔ اس وقت وہ کھینچنے لگی تھی۔ سلجوق اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے اوپر علی حسنین کی مشترکہ ٹیبل تک لے آیا تھا۔ مہکا پا کی تو شرم کے مارے نکلیں ہی نہیں اٹھ رہی تھیں۔

”واٹ؟“ سلطوق نے چونک کر پہلے علی حسین کو، اور پھر سہمی ہوئی مشکافہ کو دیکھا تھا۔
”تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو کیا؟ کیونکہ علی! میں نے تجھے کبھی مشکافہ سے تو ملوایا نہیں۔ پھر یہ ملاقات کا
سلسلہ کیا ہے؟“
”نہیں تو؟“ وہ ڈرنے لگی تھی کہیں یہ سلطوق کو جتنا دے کہ اس نے مجھے تین گھنٹے تک اپنی حراست میں لیا تھا، جیل
میں قید کر دیا تھا، اور نہ سلطوق کے سامنے کیا عزت رہ جائے گی اس کی۔ علی حسین نے اس کا ڈر فوراً بھجپ لیا تھا۔
”ارے نہیں یا! میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ اس نے کپ خانی کر کے میز پر بکھو دیا تھا۔
”اچھا یہ سلطوق اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک کیس میں مل کرنا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
”ہاں! ماں ضرور۔ کیوں نہیں۔ اللہ حافظ۔“ سلطوق نے فوراً اسے کہہ دیا تھا، جیسے وہ دوبارہ بیٹھ ہی نہ جائے۔ علی حسین
اسے مصروفی گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

”جی۔“ وہ ہنوز اسی انداز میں رہتی تھی۔ بس آنکھوں کو لہروں سے ہٹا کر اپنے پیر پر گھاڑ دیں۔
 ”ایسے نہیں۔“ نفی میں سر ہلایا۔ ”میری طرف دیکھو۔“ عجب درخواست تھی۔ وہ جانتی تھی، مگر اس نے اس کی طرف

دیکھا تو پھر ڈوب جائے گی، بکھر جائے گی، اس لیے اسے دیکھنے سے یکسر گریز برتا تھا۔ وہ متواتر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”مشکا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں کر رہی ہو تم اس طرح بولو؟“ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور دونوں بازوؤں سے اسے نرمی سے تھام لیا تھا۔ کتنی مشکوں سے اس نے اپنی بجلی نظریں اٹھائیں تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو اس کی بے تاب آنکھوں میں جھانکتی رہی تھی۔ اور پھر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے خود کو چھڑا کر، دو قدم پیچھے ہٹتی تھی اور رخ موڑ کر جانے لگی، تبھی سلجوق نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ چونک گئی تھی۔ اور وہ اسے تکتے ہوئے بہت آہستگی سے بولا تھا۔

”ان آنکھوں میں سمندر کو کیوں روک رکھا ہے؟ اس بند کو توڑ دو مشکا! ابہہ جانے دو اسے، ورنہ یہ تمہیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔“ اس لہجے میں کتنی بے قراریاں تھیں، کتنی بے تابیاں ہیں اس کے لیے۔ ایک لمحے تو مشکا نے چاہا کہ سب کچھ بھلا کر اپنا آپ ہر بار کی طرح اس کی خود پیردگی میں دے دے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ سامنے کھڑا یہ شخص جو اس کی سانسوں میں مہکتا ہے، اس سے کوئی رشتہ، کوئی واسطہ نہیں ہے اس کا، یہ مہک کی محبت اور مہاک کی پسند ہے۔ اور پھر اس نے اب تک صرف دینائی تو سیکھا تھا۔ ابھی بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے چار کوئی نظریں اس کے جسم کے آ رہا ہو رہی ہیں۔ اس نے جھٹکے سے اپنی نازک کلائی اس کے مضبوط ہاتھ سے چھڑائی تھی۔

”بہالے جانے دو، کیونکہ میں یہی چاہتی ہوں۔“

”لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔“ اس نے تڑپ کر، اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ اور اپنے سے کچھ قریب کر لیا تھا۔

”پلیز سلجوق!“ اسے تکلف ہونے لگی تھی، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں، بہت ضبط کر رکھا تھا اس نے اپنے آنسوؤں پر۔

”مشکا! مت دو مجھ کو، خود کو اتنی اذیت۔ جو بھی پریشانی ہے تمہیں، ہر دفعہ کی طرح مجھ سے شیر کر دو۔ پلیز مشکا! اس طرح مجھ سے مت بھاگو۔ مت کتراؤ۔“ سلجوق نے اپنی اکلوتی شہادت سے اس کی تھوڑی پکڑ کر اوپر کی تھی۔ وہ اس لمس پر جھٹکے سے پیچھے ہٹتی تھی۔ جیسے اسے سودا الٹ کا کرٹ چھو گیا ہو۔

”گھر چلو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ اب وہ اپنے ناخنوں کو دانٹوں سے چبانے لگی تھی۔

”اچھا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ چلو ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں اس کے لیے مکمل فکر تھی۔

”نہن، نہیں، نہیں سلجوق! مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ ڈاکٹر کا نام سنتے ہی ڈر گئی تھی۔ سلجوق نے بغور اس کی سمت دیکھا تھا۔

”اوکے، لیکن اس شرط پر کہ کل تم مجھ سے گھر آ کر مل رہی ہو۔“

”اوکے۔ میں، میں آ جاؤں گی۔ پلیز اب تو چلو۔“ اسے پھر سے بے چینی ہونے لگی تھی۔ اس کے جسم کو پھر سے غلبہ ہونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

”بی بی جان!“ آج وہ پھر بکھر رہی تھی، ٹوٹ گئی تھی، اس کا روم روم دکھ رہا تھا، اسے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اور جب کبھی آنسو اپنا ضبط کھود دیتے تو وہ سیدھا بی بی جان کے پاس آتی، جو اسے اپنی نرم گرم آغوش میں چھپا لیتیں تھیں۔ صرف وہی ہستی ہی تھیں، جو اسے ٹوٹے، بکھرے سے زیر ہونے سے بچا لیتی تھیں، جس سے تھوڑا سا اس کی بے قرار روح کو قرار آ جاتا تھا، لیکن آج تو اس نے حد ہی کر دی تھی، آج اس سے اپنا ٹوٹا، بکھرا اپنی حد درجہ شکست خوردگی سنبھالی ہی نہیں جا رہی تھی، آج وہ مکمل کر پتی کر پتی ہو گئی تھی۔

آج بی بی جان ہار گئی تھیں۔ ان سے مشکا کا کی شکست خوردگی بھی برداشت نہ ہوئی تھی۔ وہ خود بھی آج بہت روٹی تھیں۔ مشکا کا کی بے بسی پر۔ مشکا کا کو آج وہ سمیٹ نہ سکی تھیں۔ اس لیے وہ خود بکھر کر رہ گئی تھیں۔ آج ان کی ساری حدیں جواب دے گئی تھیں۔ بے مشکا کا کی کوئی ٹنگی، کوئی سکی روک نہ پائی تھی۔

☆☆☆

کتنے دنوں بعد آج وہ آیا تھا۔ گاڑی سے نکل کر وہ دونوں اندر جانے لگے تھے کہ اس کی نظر سامنے واقع سوٹ میں ملیں، سفید دھڑے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے، وہ کوئی بے قرار روح معلوم ہوئی تھی۔
ان کے اس حصے میں جہاں بہت سے پھولوں کے پودے تھے، وہیں ایک آم کا درخت تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی، اس درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔
”مشکا کا!“ وہ بے تابی سے اس کی سمت بڑھا تھا۔ کتنے دنوں بعد تو وہ آج نظر آئی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں پر بند باندھا تھا۔ نظروں کا تصادم ہوا تو گریز کر اس نے نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی مضبوط انگلیوں سے اس کے بہنے والے آنسوؤں کو اپنی پوروں میں جذب کر لیے تھے۔ مشکا کا نے چونکتے ہوئے اس جانب دیکھا تھا۔ سبوت اسی خاموشی سے اس کی طرف بکتا رہا تھا۔
”مشکا کا! پلیز لوٹ آؤ۔“ یہ کیسی التجا کر رہا تھا وہ، جو کہ اب اس کے لیے ناممکن ہے۔ اور دوسروں کے لیے ناقابل برداشت۔

”اتنا ظلم خود پر اور مجھ پر مت کرو۔ میرا دل، میری بے چین روح صرف تمہارے لیے ہی منتظر ہے۔ اسے اتنا مت تڑپاؤ۔“ وہ خاموشی سے اس کی سمت بکتی رہی تھی۔ کل ہی تو اس نے ماما اور خالہ جانی کی فون پر کی گئی گفتگو سنی تھی۔ سبوت اور مہک کی گفتگو کی تیاریوں کا ذکر ہو رہا تھا۔

”یعنی تم اب پرانے ہو جاؤ گے۔ ہمارے درمیان فاصلہ مزید سے مزید ہو جائے گا۔“ اس کے دل و دماغ میں طوفان اٹھنے لگے تھے۔ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا کسی عذاب سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ یہ یقین ابھی تک اپنے دل کو نہ کر پائی تھی کہ جس کو اس نے اپنی زندگی کا محور سمجھا، اپنی تمام تر چاہتوں کا امین بنایا، وہ اس سے کتنے دور فاصلے پر ہے۔ وہ جلدی سے سائیڈ سے نکل کر اندر کی سمت بھاگی تھی۔ راستے میں کھڑا علی حسنین بہت غور سے اسے تک رہا تھا۔ دو سینکڑ تک وہ وہاں رک کر دیکھنے لگی تھی۔ پھر اپنے کمرے میں جا بند ہوئی تھی۔

”کیوں کر رہی ہے وہ میرے ساتھ اس طرح؟“ وہ علی کے پاس آیا تھا۔

”ریلیکس یار! ابھی وہ صدمے میں ہے۔“ اس نے افسردہ سے کھڑے سبوت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”یہی تو میں چاہتا ہوں کہ وہ صدمے سے باہر آئے، مجھ سے بات کرے۔ لیکن تم نے دیکھا مجھے دیکھ کر وہ کیسے بھاگی ہے۔ علی میری مشکا کا ایسی نہیں تھی۔ وہ تو میرے آگے پیچھے پھرنے والی تھی۔“ اس کی آنکھوں کے گوشے تکلیف سے بھیگ گئے تھے۔ علی حسنین اسے اندر لے آیا تھا۔

☆☆☆

”بی بی جان! ناشتہ، بی بی جان! ناشتہ۔“ وہ فریش فریش سی صبح گیارہ بجے سو کر اٹھی تھی۔ اور بے دھیانی میں اپنے پرانے انداز سے بی بی جان کو کپکارنے لگی تھی۔ اسی وقت وہ بھی اندر داخل ہوا تھا۔

”مشکا کا! بی بی جان نہیں ہیں۔“ وہ آکر اس کے سائیڈ والی چیر پر بیٹھ گیا تھا۔

”اودا!“ وہ کچھ افسردہ سی ہوئی تھی۔ کانٹے، چمچے واپس رکھ کر چہرہ تھوڑا نیچے جھکا لیا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اب اس کا خیال

رکھنے والی، جان سے زیادہ چاہنے والی عزیز ہستی اس جہان فانی سے گزر چکی ہیں۔ اسے میں ایک نوکرانی اس کے لیے فرسے میں رکھے ناشتے کے لوازمات لے آئی تھی، جسے دیکھ کر سلجوق کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ چھوٹی سی پلیٹ جو کہ کروں سے گندی ہو رہی تھی، اس کے بیچ میں جلا ہوا اٹھ اور ایک ایسی ہی پلیٹ میں بھی میں ڈوہنی دو توں رکھی تھیں، جو شاید کھل یا پرسوں کی ہوں گی، چائے کے کپ کا بھی یہی حال تھا۔ سلجوق کا تو منہ سے پارہ ہی پانی ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت گھور کر نوکرانی کی طرف دیکھا تھا، جو اس کی نظروں سے ہم کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ اب اس کو کیا معلوم تھا کہ یہاں سلجوق بیٹھا ہوگا۔ مشکاکہ نے یہ سب دیکھا تو وہاں سے اٹھنے لگی تھی۔

”آں ہاں۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ”بیٹھ جاؤ یہاں۔ میں خود تمہارے لیے ناشتہ بنا کر لاتا ہوں۔ اور تمہیں یہاں سے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اپنا مکمل استحقاق استعمال کرتے ہوئے، اس پر تنبیہ کرتے ہوئے، لیکن میں چلا آیا تھا، جبکہ نوکرانی سلجوق کی مشکاکہ پر توجہ دیکھتے ہوئے، وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی تھی۔ دس منٹ بعد وہ ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے لے آیا تھا۔ اور اپنا بھر پور استحقاق استعمال کیا تھا۔ خود اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں لقمے بنا بنا کر ڈالتا گیا تھا اور وہ اس کا ذہن بہت پیچھے اپنے بچپن کے زمانے میں گرداں تھا۔ ”جب وہ مشکاکہ کو اس طرح اپنے ہاتھ سے ناشتہ کرایا کرتا تھا۔ اور وہ کھاتے کھاتے بڑے پیار بھرے انداز میں اسے ہکا کرتی تھی۔“ اس وقت بھی وہ اپنی سوچوں میں گہری بیٹھی تھی، جب ہی سلجوق نے اسے چونکا دیا تھا۔

”مشکاکہ! اور لاؤں بٹاؤ اسے تقریباً سارا ہی کھلا چکا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو گھڑوں پانی میں خود کو ڈوبتا پایا تھا۔ مشکاکہ نے چلیں اٹھا کر اس کے سرکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔ جھینپ کر اس نے اپنی نظریں چرائیں۔ اسی وقت مہک اور مسز نامہ یوسف آئی تھیں۔

”ارے سلجوق آپ؟“ مہک ہزاروں لمحوں کو کم فاصلے میں طے کر کے اس تک پہنچی تھی۔ مشکاکہ پر نظر پڑی تو حلق میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی کمزور لمحہ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی دے۔

”ہاں یاد آ یا مشکاکہ؟“ ماریہ راستے میں مٹی تھی۔ اس نے تمہیں فوراً اپنے گھر بلایا ہے۔ وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔“ ماریہ کو وہ جانتی نہ تھی، نہ ہی کبھی دیکھا تھا، بس ایک دفعہ اتفاق سے مشکاکہ کے منہ سے موبائل پر ہونے والی گفتگو سن لی تھی، جس میں ماریہ کا نام کان میں پڑا تھا۔

”اچھا۔ تو کیا وہ لندن سے آگئی؟“ اس نے اپنے ہی آپ سے سوال کیا تھا۔ ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے سلجوق پر ڈالی تھی۔ اور پھر بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے وہاں سے ہٹتی چلی گئی تھی۔ مہک نے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیک سلجوق کے آگے رکھ دیئے تھے۔ اور اس کو اپنی باتوں میں الجھانے کی مکمل کوشش کی تھی، جبکہ سلجوق کی نظریں اب تک مشکاکہ کے چھوڑ جانے والے قدموں کے نشان پر ٹھہر گئی تھیں۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ مہک نے اسے سلجوق کی نظروں سے ہٹانے کے لیے اس جھوٹ کا سہارا لیا تھا، ورنہ مہک کہاں ماریہ کو جانتی یا پہچانتی تھی، اور پھر ماریہ تو یہ ملک ہی چھوڑ گئی تھی۔ درد کی ایک ٹیس اس کے بائیں پہلو میں اٹھی تھی۔ جسے اس نے سرخ سے دبا ڈالا تھا۔

☆☆☆

”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا موسیٰ! کہ یہ بات میں سلجوق سے کیسے کروں گی؟ وہ تو یہ بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جائیں گے۔“ مسز نامہ یوسف، سلجوق اور مہک کی منگنی پر زور دے رہی تھیں، بلکہ اس سنڈے کا کہہ بھی دیا تھا۔ اور مسز سامیہ موسیٰ نے یہ بات اب تک سلجوق سے نہیں کی تھی۔ اور شاید وہ خود میں ہمت پیدا بھی نہیں کر پارہی تھیں۔

”کون کی بات؟“ ”سوی رضا صبح کے غنڈہ بیچ کا مطالعہ کرتے ہوئے بولے تھے۔“
”آپ یہ نہیں سمجھتے تھے تو کہوں نا؟“ ان کا اشارہ غنڈہ بیچ کی طرف تھا۔

”مہیہ بیچے رکھ دیا۔ اب بولے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے دھڑکے پیچھے کے بھاٹکا دکھایا۔ آپکبیری ہیں کہ اس منڈے بلجوق اور مہک کی دھوم دھام سے متعلق کر دی جائے، جبکہ یہ بات میں نے ابھی تک بلجوق سے نہیں کی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں اس بات کو لے کر۔“ ان کے چہرے کے نقوش سے واضح پریشانی محسوس ہوتی تھی۔

”آپ نے مشکافہ کے لیے دوبارہ بات نہیں کی تھی؟“ ”سمر سامیہ موی کی تنبیہ کی کو دیکھتے ہوئے موی رضا کو بھی تنبیہ ہونا پڑا تھا۔“

”کی تھی۔ محرت آپ نے مجھے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔“ وہ بے بسی سے بولیں نہیں۔
”انور آپ تو جانتے ہیں کہ آپ کا ہر فیصلہ مل ہوتا ہے۔ ان کی ہر بات پھر پرچی لکیر کی طرح ہوتی ہے۔ میں بہت ذریعہ

ہوں موی!“ انہوں نے موی رضا کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
”ہوں!“ ”مسئلہ تو واقعی کافی سیریس ہو گیا ہے۔“ ”موی رضا نہ سوچنا ناز میں سر ہلانے لگے تھے۔“
”تو آپ بتائیے تاکہ یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ جبکہ میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ ہم بلجوق کے بزنس کے مسئلے میں جو کم از کم

کرنے وہ بار بار ہے ہیں، ہم جب تک ٹھہر جاتے ہیں، لیکن آپ نے کہا کہ ہم جب مہک اور بلجوق کی شادی کریں گے۔“

”پلیز موی! کچھ سوچیے نا؟“
”ہوں!..... سوچتے ہیں ہمیں! آخر ہمارے اکلوتے بیٹے کی زندگی کی بات ہے۔“ انہوں نے میز پر رکھا ہوا غنڈہ بیچ دوبارہ

اٹھالیا تھا۔

”اس سے جان چھوٹے گی تو سوچیں گے نا؟“ وہ ان کے غنڈہ بیچ پر ہنسنے پر جل کر رہ گئی تھیں۔ اور تک کر کرے سے ہی

بار کھل گئی تھیں۔
”یہ خاتون بھی نا، ذرا داسی باتوں کو مینیشن بنالیتی ہیں۔“ انہوں نے اپنی سمر کو مسکرا کے دیکھا، ایک بار پھر غنڈہ بیچ میں گم ہو گئے تھے۔

☆☆☆☆

”سلمیٰ! انا حالہ جانی کہاں ہیں؟“ ”سلمیٰ (نوکرانی) جو کام کے ساتھ لنگٹا نے میں بھی گمن تھی۔ چونکہ بڑی تھی۔“
”بی بی جی! وہ کہیں باہر گئی ہیں۔“ کچھ دیر تک وہ چپ رہی تھی۔

”کب تک آئیں گی؟“ اس کے جسم کا ہر عضو تکلیف سے ٹوٹ رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ خود کو بے دردی سے نوچ ڈالے۔ پھر بھی کتنے ضبط سے خود پر قابو کیے تو کرانی کے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی، جو کہ اس کے دوبارہ پوچھنے پر رک گئے تھے۔

”معلوم نہیں لی بی جی! اوپر چھوٹے صاحب ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔ شاید انہیں معلوم ہو۔“ مشکافہ ہاتھوں کو آپس میں سلنے کے بعد، کچھ سوچ کر بلجوق کے کمرے کے آگے کھڑی بنا دستک دیے اندر آ گئی تھی۔ وہ میز پر جھکا اپنی کسی فائل پر

کام کر رہا تھا۔ آہٹ پر دروازے کی سمت رخ پھیرا تو حسب چھوڑ چھاڑ اس سمت چلا آیا تھا۔
”مشکافہ! تم۔ تم آؤ نا اندر۔ وہاں کیوں کھڑی ہو؟“ کتنا خوش ہوا تھا وہ اسے یکدم اپنے سامنے، اپنے کمرے میں پا کر۔
”جیسے ٹھہرے ہوئے دریا میں ٹکر سے جلتی گنج اٹھے ہوں۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اس کا بازو دھکم کر صوفے تک لے آیا تھا۔“

”کتنی کمزور ہوتی جا رہی ہو شکاف! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ایسی تو نہیں تھیں؟“ اس کی سوتی ہوئی سرخ آنکھیں، جن سے گرد گہرے، براؤں ملتے اسے کمزور بنا رہے تھے، کبھی پتک عنائی رہنے والے ہونٹ آج نیلے پڑے ہوئے تھے، سفید حسین چمکتا ہوا رنگ آج زرد پڑا ہوا تھا۔ اس کا بیلیو جینز پر پر پل سادی پلٹے شرٹ میں ملبوس، وہ اپنے ناخنوں کو کتر رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک سلجوق اس کے پاس بیٹھا اس کو پیار سے نکٹار ہاتھ، جو کہ افسردگی کا مکمل پیکر بنی ہوئی تھی۔

”سلجوق! وہ مجھے خالہ جانی سے کام تھا۔“ وہ اس کی نظروں سے بچنا چاہتی تھی۔ اسے اپنا آپ کھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جی جلدی سے اپنے ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں سے چھڑائے تھے، اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک سلجوق کے ہاتھوں میں اب تک تھی۔ وہ اس کا گریز کچھ کر دیر سے سے مسکرایا تھا۔

”مگر تمہاری خالہ جانی یہاں تو نہیں ہیں۔“ وہ اب اسے جٹک کر رہا تھا۔ مگر وہ کچھ کہاں رہی تھی۔ اس کا تو نشہ لوٹ رہا تھا۔

”سلجوق کا خیال تھا، ورنہ اب تک تو اس کا وہ پورا کمرہ الٹ دیتی۔ ابھی کل ہی تو اس نے سرخ نہ پا کر اپنا کمرہ جس جیس کر ڈالا تھا۔ اور کتنی دیر بعد جب اسے بیڈ کے کونے پر پڑا ہوا ملا تو اسے یوں لگا، جیسے کھوئی ہوئی میراث، جیسے اس کی کھوئی ہوئی، ٹوٹی ہوئی زندگی دوبارہ عطا ہو گئی ہو۔ وہ سرخ لینے کی مقدار میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ جی اسے مزید پیسوں میں اضافہ کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر اب کیا کرے؟ کیا سلجوق ہے؟“ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ سلجوق کی تھمبیر آواز نے اس کی سوچوں کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ چونک کر اس کی سمت بھٹنے لگی تھی۔ اسے سلجوق کی آنکھوں میں بے پناہ جھلکتی وارنگیوں سے خوف آنے لگا تھا۔

”میں۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔“ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی تھی، مگر سلجوق کے مضبوط ہاتھ نے اس کی نازک کلائی پکڑ لی تھی۔ وہ ساکت سی اس کی سمت کھینچی چلی گئی تھی۔

”مشکا! آج تمہیں بتانا ہی ہو گا۔ آخر کیوں بدلتی جا رہی ہو تم؟“ اس نے دوبارہ سے مشکا کو صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ وہ جو بڑی مشکل سے اپنے مضبوط کا استھان لے رہی تھی، یکدم ہی پھٹ پڑی تھی۔

”پلیئر سلجوق! پلیئر، تم چاہتے کیا ہو آخر؟ چھوڑ دو میرا چچا۔ مجھے کسی بھی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں ہے تم میں۔“ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر، جھٹک کر بیٹھ لی تھی۔

”کیوں جھوٹ بول رہی ہو تم؟ اور کب تک بولو گی؟“ سلجوق نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اور وہ معصومیت سے اسے کٹے چلی گئی تھی۔ ڈھیر سا پانی اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا۔ کتنے لمبے تک سلجوق بے بسی سے اس کی آنکھوں میں نکلتا چلا گیا تھا۔ شاید ان میں اپنا عکس ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مشکا نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چرائی تھیں۔ سلجوق نے اس کی نگاہیں چرانے پر خود کو ریلیکس کر لیا تھا۔ وہ آخر جان ہی کیسے سکتا تھا کہ اس کی یہ بے رخی، بے اعتنائی اور بے بسی کے پیچھے وجہ کیا ہے، اس نے کھوجنے کی کوشش ہی کب کی تھی؟ وہ تو بس صرف اپنے کمرے میں بند گھنٹوں اس کے بدلے ہوئے رویے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

”اچھا مجھے بتاؤ؟ کیا کام تھا تمہیں اپنی خالہ جانی سے؟“ اسے اس کی معصوم آنکھوں پر رحم آ گیا تھا۔

”وہ۔۔۔ وہ مجھے پچاس ہزار روپے چاہیے تھے۔ تم دے دو؟ آئی سویر، میں تمہیں لوٹا دوں گی۔“ کتنی غلیظ کچھڑ

میں ڈوب چکی تھی وہ۔ ایک فقیر سے بھی بدتر، وہ مشکا کو جس نے کبھی کسی کے آگے دست سوال نہ کیا تھا۔ کیسے دردزدہ ہاتھ پھیلائے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پہلے ماما، بی بی جان، خالہ جانی، ماریہ، یہاں تک رشید ڈگر سے اور اب سلجوق کے آگے فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا لیے۔

”لوٹنے کی کیا بات ہے۔ میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ لیکن آج تم مجھے یہ بتاؤ دو! آخر تم اسنے پیسوں کا کرتی کیا ہوا“
 وہ دھمکنی سے لہجہ چاہتا تھا، جانتا چاہتا تھا، آخر اس کی سرگرمیاں کیا ہیں؟
 ”وہ میں تمہیں کہیں بتا سکتی۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر دو قدم کے فاصلے پر جا کر کھڑی تھی۔ سلوٹی نے ابور سے ہلکا سا ہنسی بھر کر کہا ہوا
 تھا۔ اور اس کے نزدیک جا کر بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے کو تھام لیا تھا اور اسے ہلور کھٹکا چلا گیا تھا۔ مشکاکہ
 نے جبکہ کمر کو اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اور پھر بہت ہولے سے بولی تھی۔
 ”سلوٹی اپلیز دے دو نا۔“ کتنا مضطرب تھا اس کے بے قرار حسن میں۔ سلوٹی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس کی بے
 قرار یوں کو سمیٹ کر اس کے بکھرے نازک ہیکر کو اپنے اندر سمو لے۔
 ”اوکے۔“ وہ لمبا سانس کھینچ کر سائیڈ ٹیبل تک آیا تھا۔ اور دروازے چیک بک نکال کر اس پر سائن کر دیا تھا اور وہ چیک
 بک اس کے سامنے کر دی تھی۔ مشکاکہ کی آنکھوں میں ہزاروں پل اٹھے تھے۔ جیسے کسی بستر مرگ پر لیٹے ہوئے سریش کو
 زندگی کا پروانہ ملتا ہو۔ اس نے جلدی سے چیک بک تھام لی اور ٹیبل پر پڑی فائل پر رکھے تین سے اس کے سامنے چیک پر
 50,000 Only لکھا تھا۔ مسکرا کر ”تھینک یو“ کہتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی۔ جب اس نے آواز دی تھی اور وہ رک گئی
 تھی۔

”اپنے بند لٹنے کی وجہ نہیں بتاؤ گی؟“ وہ رخ پھیر کر کھڑی رہی تھی۔ اس کے سوال پر اپنے ہاتھ کی انگلیاں بھینچ لیں اور ضبط
 سے آنکھیں میچ لیں تھیں۔
 ”آخر وہ بھی کب چاہتی تھی۔ تصور بھی کب کیا تھا کہ یہ سب بھی اس کی زندگی میں ہو گا؟ وہ سلوٹی سے کبھی الگ بھی ہو سکتی
 ہے۔ ہر پل ایک اسی کے لیے تو تڑپتی رہی ہے۔ کب چاہتا تھا کہ اپنی محبت سے یوں دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس وقت بھی تو وہ
 بہت مجبور ہو کر اس کے پاس اس کے سامنے آئی تھی۔ جانتی تھی سلوٹی اس کی ہر موڑ پر مدد کرتا آیا تھا۔ بھی تو اپنی اور اس کی محبت
 بھلانے کے لیے اس نے موت کی ڈگر پر زندگی کی تلاش کی تھی۔“ وہ جواب دینے بغیر دروازہ کھولتی ہوئی بھاگنے کے سے
 انداز میں سیز حیاں عبور کرتی چلی گئی تھی۔ سلوٹی بھی اس کے پیچھے گیا تھا، مگر پھر اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوتی چلی گئی
 تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کی گاڑی سے اٹھتا ہوا دھواں تکٹا چلا گیا تھا۔ اور پھر نڈھال زدہ قدموں سے کمرے میں واپس چلا
 آیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے مشکاکہ کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے لگا تھا۔
 ”تمہیں مشکاکہ! میں تمہیں کہیں کم نہیں ہونے دوں گا۔ تمہاری ہر منزل، تمہاری ساری راہیں، سلوٹی موسیٰ پر ہی آخر ختم ہوتی
 ہیں۔ تمہیں واپس میرے پاس ہی آنا ہے۔ اور اب مجھے اپنے باہر جانے سے پہلے پہلے تمہیں قانونی و شرعی کے مطابق اپنے
 نام کرنا ہے۔“ اس سوچ پر وہ دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔ اور اب آفس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

”دیکھو پلیز اب تو دے دو۔“ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، تڑپ رہی تھی، اندر ہی اندر ختم ہوتی جا رہی تھی، اپنے ناخنوں کو
 بے دردی سے کاٹ رہی تھی، یہ دیکھتے بغیر کہ ان میں سے آہستہ آہستہ خون رسنے لگا ہے، لیکن رشید ڈوگر کے کو اس کی حالت
 دیکھ کر مزہ آرہا تھا۔
 ”لیکن یہ تو تم نے پچھلا حساب واپس کیا ہے۔ نیا مال چاہیے تو اور پیسے لاؤ۔“ اتنا بے رحم اور سنگدل تھا وہ۔ اس کی غیر
 حالت کو بھرپور انجوائے کر رہا تھا۔
 ”میں کہاں سے لاؤں؟ اور تو نہیں ہے۔ پلیز میں تمہیں بعد میں دے دوں گی۔ ابھی تو دے دو۔“ وہ اس کے سامنے ہاتھ
 جوڑنے لگی تھی۔

”فحیک ہے، تو پھر فی الحال تم مجھے یہ چاہی دے دو۔“ اس نے مشکا کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی چھین لی تھی۔
 ”نہیں، نہیں پلیز یہ مجھے واپس دے دو۔ یہ گاڑی میری ماما کی ہے۔“ اس نے چابی واپس لینی چاہی تھی، کیونکہ وہ یہ گاڑی
 مسز نامیہ یوسف سے چھپا کر لائی تھی۔ اپنی تو وہ سچ ہی پہلی تھی اسی کے ہاتھ، جس کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ لیکن یہ وہ نہیں
 دے سکتی تھی۔ مگر رشید ڈوگر نے اپنی کینٹکلی دکھارہا تھا۔ کتنا غیبت و کمرہ چہرہ تھا اس کا۔
 ”جھمیں یہ چاہیے نا؟“ اس نے مشکا کے کمروری، وہ خاکی لفافہ اس کے سامنے کر دیا تھا، جسے مشکا نے فوراً بھٹ لیا
 تھا۔ اس نیو ماڈل کی کار پر تو اس کی بہت پہلے سے نیت تھی۔ اور پھر جب آج موقع ملا ہے تو وہ موقع کیوں گنوا تا۔
 ”لیکن میں تم سے یہ گاڑی لے لوں گی۔ یہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔“ وہ کہہ کر وہاں سے ہنسی چلی گئی تھی، کیونکہ اس
 گاڑی سے زیادہ اسے اس خاکی لفافے کی زیادہ ضرورت تھی، جس میں اس کی ٹوٹی ہوئی زندگی تھی۔

”اونہ! دیکھا جائے گا۔“ وہ خیانت سے ہنستا ہوا، اس کی گاڑی کی جانب بڑھا تھا۔
 ”پکڑو اسے۔“ انسپکٹر علی حسنین جو کب سے اس اشتہاری مجرم کی تلاش میں تھا، آج اسے پکڑ ہی لیا تھا۔ لیکن یہ منظر اسے
 کسی دھچکے سے کم نہیں لگا کہ، ”مشکا تو اس کے پاس کیا کرنے آئی تھی؟ اور وہ کون سا لفافہ لے کر گئی ہے؟“ وہ رشید ڈوگر سے کو
 حوالدار کے حوالے کر کے اس کے پیچھے بھی بھاگا تھا، مگر افسوس وہ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گئی تھی۔
 ”واٹ؟ کیا کہہ رہے ہو علی اتم۔“ اس خبر سے اسے زبردست شاک لگا تھا۔ لمبے بھر کے لیے تو ایسا لگا جیسے صد سے
 دماغ کی رگ ہی نہ پھٹ جائے، دل کی دھڑکن ہی نہ بند ہو جائے، اپنا آپ جیسے زمین و آسمان کے سچ ہوا میں معلق لگا تھا،
 رشید ڈوگر سے کو جیل میں بند کرنے کے فحیک دو گھنٹے بعد انسپکٹر علی حسنین اس وقت، سلجوق رضا کے آفس میں اس کے کمرے
 میں موجود تھا۔

”ہاں سلجوق! یہ سچ ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ مگر تم تو زیادہ قریب تھے اس کے۔ پھر اس بات
 سے تم کیوں بے خبر رہے؟“
 ”مجھے شک تو سی سائیڈ پر گزارا تھا، مگر یقین میں اس لیے نہ بدل سکا کہ اتنی بڑی بے وقوفی کی اس سے امید جو نہیں تھی۔“ وہ
 کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”علی! اس وقت وہ کہاں ہوگی؟“ وہ دوبارہ مڑ کر اس کی سمت آنکھ برا تھا۔ انداز دلچسپ نہایت پریشانی لیے ہوئے تھے۔
 ”یہ تو مجھے نہیں معلوم، لیکن سلجوق! وہ بہت تکلیف میں ہے اور تم ہی ہو جو اسے اس وقت سنبھال سکتے ہو۔ سلجوق! ابھی بھی
 کچھ نہیں بگڑا ہے، لیکن اگر ڈرا اور دیر ہو گئی، تو وہ اس زہر میں مکمل ڈوب جائے گی۔“
 ”یہ میں نے کیا کر دیا؟ کیوں بے خبر ہاتا اس سے؟ کیوں جدا کر دیا خود سے اسے؟“ سلجوق کا غم و غصے کی شدت سے
 چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

”علی! اتم نے اسے کیوں اریسٹ نہیں کیا؟“ سلجوق کو افسوس ہونے لگا کہ، کاش وہ مشکا کو گھر سے جانے ہی نہ دیتا تو
 اسے حقیقت تو پتہ چل جاتی۔ غور کرنے پر اسے اب اس کی بگڑتی طبیعت کی اصلیت دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگی تھی،
 کہ کیوں وہ اس سے نظریں چرا جاتی تھی، کتنا کراہتا تھا اس کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔

”علی! ہو سکتا ہے وہ گھر گئی ہو۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ میز پر سے چابی اور موبائل اٹھا کر آفس سے باہر نکل آیا تھا۔ اور
 سیدھا ”یوسف والا“ چلا آیا تھا۔ گھر پر تو کڑوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ دونوں سیدھے اوپر مشکا کے کمرے میں چلے آئے
 تھے، جو آج اتفاق سے لاکھ نہ تھا۔

”اومانی گاڑا!“ کمرے کی انتہائی ابتر حالت دیکھ کر دونوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ وارڈ روپ کے دونوں

دروازے کھلے ہوئے تھے، اور سارے کپڑے آدھے اندر اور آدھے باہر لٹک رہے تھے، ہمسری کی بیٹھینٹ کا بھی یہی حال تھا، نا جانے کتنے عرصے سے اس کمرے کی صفائی نہیں کی گئی تھی، جگہ جگہ دھول اُٹی ہوئی تھی، دو بواؤں کے چنٹ کا طبلہ بھی بہت خراب تھا، جگہ جگہ سے چنٹ اکٹرا ہوا تھا، اس کے علاوہ کسی کو کیلی شے سے وہاں گاڑا گاڑا بھوک لکھا ہوا تھا، بھوک نے اس نام پر اپنا ہاتھ دبیرا تھا۔

”اوو مشکاؤ! او! پس آ جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو۔“ سلجوق نے آنکھوں کے گوشوں سے ٹپنے والے پانی کو صاف کیا تھا۔ ہمسری پر رکھے نیچے کو ہٹایا تو وہاں دس، بارہ خالی سرخ اور بہت سی خالی شیشیاں پڑی ہوئی تھیں، جو کہ مشکاؤ کی بے وقوفی کا واضح ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کا یہ جال تھا کہ میک اپ کے سامان کے بجائے جوتے، چل اور کچھ سرخ کی شیشیاں الٹی سیدھی پڑی تھیں، جیسے غصے سے پیچکنی ہوں، ڈریسنگ ٹیبل کے مرمر پر ٹیبل اسٹک سے ”آئی لو یو سلجوق“ لکھا ہوا تھا۔

”آئی لو یو مشکاؤ!“ سلجوق نے دھمے سے کہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر سلجوق تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے دل کے کتے نکلے ہوئے ہوں۔

”سلجوق! اتنے چھوٹے سے کمرے کی وہ صفائی نہیں کرتی۔ تیرا تو پھر کباڑہ ہی کر دے گی۔“ علی حسنین نے کمرے کا مکمل جائزہ لینے کے بعد، سلجوق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مذاق کہا تھا۔

”میں اس وقت پریشان ہوں اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔“ سلجوق نے اس کے سینے پر ہلکا سا مذاق جزو دیا۔ خود کو سنبھالنے میں اس نے لمبے لمبے نہیں لگائے تھے۔

”تمہیں یاد امیری کہاں بجال، میں نے تو تیری آگے بسر ہونے والی زندگی کا حال بیان کیا ہے۔“

”کہو اس مت کر۔ یہ سب تیری وجہ سے ہے۔ تجھے مشکاؤ کا کبھی اسی وقت اریسٹ کر لیتا چاہیے تھا۔“

”خوب فرمایا آپ نے، تاکہ اب کی بار وہ مجھے حقیقت میں ہی پھانسی پر لٹکا دے۔“ علی کے بے موقع بات پر سلجوق نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

”او کے بار! گھور تو مت۔“ وہ سمجھنے کی ناکام ایکٹنگ کرنے لگا تھا۔

”میرا خیال ہے مشکاؤ اسی کلب میں ہوگی۔ چلو وہاں چلتے ہیں۔“ علی دیکھ رہا تھا کہ اس وقت سلجوق کافی ڈپر سڈ ہے اور اس کنڈیشن میں وہ مشکاؤ کو سامنے پا کر کچھ بھی کر سکتا تھا، اس لیے وہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ ریپلیکس ہو جائے۔

”کہاں بھی نہیں ہے۔“ وہ دونوں کلب سے بھی مایوس ہو کر نکلے تھے۔ ”کہاں ڈھونڈوں میں مشکاؤ! تمہیں؟“ سلجوق نے بے بسی سے اپنا سراسیمہ رنگ پر رکھ دیا تھا۔ پریشان تو علی بھی بہت تھا مگر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے سلجوق! واپس گھر چلتے ہیں۔ مشکاؤ واپس گھر ہی تو آئے گی۔“ علی نے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

شور شرابے سے بھرپور ماحول میں داخل ہو کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تھی۔ کلب کی کونے والی میز پر وہ سر میز کی سٹا پر ڈالے، خود سے بھی بے خبر سی تھی۔ لیلیٰ ارد گرد سے بے پروہ اس تک پہنچی تھی۔ اسے کلب کے منیجر نے یہاں بلوایا تھا۔ اس نے اکثر ماریہ، لیلیٰ اور مشکاؤ کو یہاں ایک ساتھ دیکھا تھا۔ مشکاؤ نے اس وقت نشہ آور انجکشن اور ڈرگز کا کافی مقدار میں یوز کر لی تھی۔ کلب کے منیجر نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی، مگر وہ نہیں مانی تھی۔ اس لیے اس نے ماریہ کے گھر فون کیا، جہاں سے پتہ چلا کہ وہ لندن چلی گئی ہے، پھر اس نے لیلیٰ کو کونٹیکٹ کیا تھا جو اس وقت اس کلب میں مشکاؤ کی میز کے پاس تھی۔

”مشکاۃ!“ بہت ہولے سے اے پکارا تھا۔ مگر وہ مکمل طور پر نشے کے زریعہ اثر تھی۔

”مشکاۃ!“ ایک بار پھر جھک کر پکارتے ہوئے اے ہلایا تھا۔

”ہوں کیا ہے؟“ اس کی خاموشی آواز آواز ابھری تھی۔ اس نے بمشکل بند ہوئی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی تھی۔

”چلو کھڑی ہو، چلو میرے ساتھ۔“

”کہاں جانا ہے؟“ مہوش لہجے میں مندی آنکھوں سمیت سوال کیا تھا۔

”تم چلو میرے ساتھ۔“ وہ اے زبردستی کھڑا کر کے گاڑی تک لے آئی تھی۔

”تم جیسی بے وقوف اور عقل سے پیدا لڑکی، میں نے کہیں نہیں دیکھی۔“ وہ گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ اسے سناتی

بھی جا رہی تھی۔ جو کھڑکی سے سر نکالنے نشے میں مدہوش تھی۔

”مار یہ خود تو چلی گئی اور تمہیں اس بری لت اس عذاب میں ڈال گئی۔ پتہ نہیں لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ خود تو اس کام کو

تحمل سمجھتے ہیں۔ لائف جسٹ فار انجوائمنٹ کی طرح گزارتے ہیں۔ اور جب چارم ختم ہو جائے تو اپنی راتیں الگ کر

لیتے ہیں، دوسروں کو اس اذیت میں مبتلا کر کے۔“ علی کو مار یہ پر بہت شدید غصہ آ رہا تھا۔ بس چلتا تو وہ اسے شوٹ ہی کر

دیتی، مگر وہ سامنے ہوتی تو۔

”تس آ رہا ہے مجھے تم پر۔“ مشکاۃ! پلیز چھوڑ دو یہ زہر۔“ وہ بچی انداز میں بولی تھی۔ اسے مشکاۃ کی حالت دیکھ کر بہت

افسوس ہو رہا تھا۔ اتنی اچھی لڑکی کس بیماری میں گھر گئی تھی۔ مشکاۃ کا گھر آچکا تھا۔ وہ کچھ بولے بغیر اس کی گاڑی سے آہستہ

روٹی سے اتر گئی تھی۔ اور تمام اندر کی سمت بڑھادیے تھے۔ جانا کہیں چاہ رہی تھی اور تمام کہیں پڑے تھے۔ علی کو اس کی

حالت قابلِ رحم لگی تھی۔ اس نے اس اچھی لڑکی کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ جو جانے کیا ہوگئی تھی۔ لیکن کتنی ہی عریضی۔

وہ ٹائڈ کھڑائی، ڈیگ لگائی اپنی ہی رو میں اندر داخل ہوئی، تو سامنے لاؤنج میں سلوک پر نظر پڑی تھی، جو اسے اس حالت میں دیکھ

کر کھڑکھڑائی۔

”ارے سلوک! تم؟“ وہ اس تک آنے لگی تھی۔ سلوک کو لگا وہ اب گری اور اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہوئی، سلوک اس

تک تیز رفتاری سے پہنچا تھا۔

”آگئے تم۔ تم کہاں چلے گئے تھے مجھے کیا چھوڑ کر؟“ دیکھو میں کتنی تنہا ہو گئی ہوں تمہارے بغیر۔ لیکن پلیز اب مجھے چھوڑ کر

مت جانا۔ نہیں جاؤ گے نا مجھے چھوڑ کر؟“ سامنے بیٹھے وہ تمام لوگ مشکاۃ کی اس حالت پر ششدر ہی رہ گئے تھے، جبکہ اسے

خود انداز نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ بولے جا رہی ہے۔

”بولو سلوک! مجھے چھوڑ کر اب نہیں جاؤ گے نا؟“ اس نے سلوک کا چہرہ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں بھر لیا تھا۔

”مما کہتی ہیں میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ سلوک! وہ تمہیں مجھ سے جدا کر رہی گی، لیکن تم مجھے چھوڑو گے تو نہیں نا؟“

نشے کی حالت میں وہ اس وقت اپنی ہر پور محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا اس نے جو عام حالت میں سوچنے

کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”پلیز سلوک! بولو نہیں چھوڑو گے نا مجھے؟“ مہوشی اتنی تھی کہ اپنا سراسر اس کے کشادہ وسیع سینے پر دھریا تھا۔ اگر وہ اپنے ہوش

میں ہوتی تو یقیناً شرم سے سر گئی ہوتی۔

”مشکاۃ! میں تمہیں کہیں نہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔ چلو میرے ساتھ۔“ سلوک کا ایک ہاتھ اس کے

نازک شانے پر دھرتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے کالجھے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہٹانے

چاہے، بر وقت گم کروہ مشکاۃ کو سنبھال نہ لیتا تو وہ زمین بوس ہو چکی ہوتی۔

سوچتے ہیں اس کی بند آنکھوں کے بند پچھنے بالکل ساکت و جامد تھے۔ پادامی، بڑی بڑی روشن آنکھیں جن میں کبھی ایک دنیا حسرتوں اور امیدوں کی آباہی، اب وہاں کسی تڑپ، ایک اذیت اور اداسی نے قبضہ رکھا ہوا تھا، وہ آنکھیں پہنوں کے پیچھے بے خبر پڑی سو رہی تھیں، ان پادامی آنکھوں کا سنگھار، لائٹ براؤن تیرکمان جیسے اندر، جن کے اوپر کشادہ روشن پیشانی سے نیچے جاتی چھوٹی سی نیکی ناک اس کے چہرے کی سب سے معصوم گواہ، جس کے نیچے دو غم شدہ ہونٹوں کا جوڑا اٹھنے سے دہانے میں سٹا ہوا تھا، جو ہونٹ کبھی سرخ ہوا کرتے تھے، اس وقت وہ بالکل نیلے پڑے ہوئے تھے، زرد رخسار اور کانوں کی لوہوں تک پادامی ہلکے ہلکے بال، اس کے خوبصورت حسین چہرے کا جیسے احاطہ کیے ہوئے تھے، اور وہ موت جیسی صورت نازک سی پتلی گردن پر ایسا وہ چھی، اور چھوٹی چھوٹی سی مغربی انگلیوں والا ایک سفید نازک ہاتھ سینے تک اوڑھے کمر پر دھرا تھا، اور ایک ہاتھ بند پر تھا جس پر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ حسن کی ایک مریوطہ کتاب تھی، اُن چھوٹی، اُن پڑھی۔ رات وہ اس کی ہانپوں میں بے ہوش ہوئی تھی، تو وہ جلدی سے اسے اسپتال لے آیا تھا۔ اور اس وقت اب وہ بیڈ پر دنیا و مافیہ سے بے خبر، دوائیوں اور ڈرپ کے سہارے بے خبر نیند کی آغوش میں تھی۔ جب وہ اس کے خدوخال کو حرف پر حرف پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کا دل چاہا تھا کہ، ”وقت ختم جائے، لمحے رک جائیں اور وہ اس کے سامنے اس کے قریب اسی طرح بے خبر، ہوش و خرد سے بیگانہ و خود کو اپنی بصارتوں میں سموتا رہے۔“ وہ مکمل توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سلوٹ!“ علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اس کے حسین تصور سے باہر کھینچا تھا۔ ”آؤ، گھر چل کر کچھ دیر آرام کر لو۔ رات سے نہیں ہو۔“

”نہیں علی! اگر میں چلا گیا، تو یہ پھر مجھے جھوڑ کر چلی جائے گی۔“ اس نے بیڈ پر لیٹے ساکت و خود کو بغور دیکھا تھا۔

”کبھی نہیں جائے گی یہ۔ میں ہوں نا۔“ علی نے اسے زبردستی کھڑا کیا تھا۔ اور اسے ساتھ لیے کمرے سے باہر آگیا تھا۔

”تم اسے پہنائی پر لٹکا دینا، جس نے مشکاکہ کو یہ زبردیا ہے۔“ وہ جذبات کی یلغار میں ابھی کچھ اور کہتا کہ مشکاکہ کے روم سے نرس بھاگی بھاگی آ رہی تھی۔ علی کے پوچھنے پر وہ کہہ کر بھاگی۔

”پیشہ کی کنڈیشن بگڑ رہی ہے۔ ڈاکٹر کو بلا نا ہے۔“ سلوٹ اس کی پوری بات سننے بغیر، اندر مشکاکہ کے روم کی سمت لپکا تھا۔

”مشکاکہ! کیا ہوا؟“ وہ سائیڈ میں رکھی ٹیبل پر پڑی میڈیسن ٹیبلٹس اٹھا اٹھا کر بھینک رہی تھی۔ اور وہاں رکھی سیزر اٹھا کر اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہی چاہا تھا کہ سلوٹ نے وقت ضائع کیے بغیر اس کے ہاتھ سے سیزر لے کر بھینک دی تھی۔ یہاں تک مشکاکہ نے اپنی کلائی میں لگی ڈرپ بھی بے دردی سے نکال دی تھی، جس سے وہ اپنے اندر تکلیف محسوس کر رہی تھی۔

”سلوٹ!“ وہ اس کا گریبان پکڑ کر بولی تھی۔ ”سلوٹ! پلیز مجھے سرخ چاہیے۔ مجھے سرخ چاہیے۔ سلوٹ! مجھے دے دو نا، ورنہ میں مری جاؤں گی۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔ مجھے سرخ دے دو پلیز سلوٹ!“ وہ اسے سوچ رہی تھی۔ یہاں تک اس کی گریے شرت تک پہنچاؤ الٹی تھی۔ وہ اس کی منتیں کر رہی تھی، اس سے التجائیں کر رہی تھی۔

”سلوٹ! تم تو میری ہر سوز پر مدد کرتے ہوتا؟ پلیز اس وقت مجھے سرخ دے دو۔“ سلوٹ سے اس کا رونا، تڑپنا، مچلنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی، تو بڑھ کر اپنی محبت کو، اپنی چاہت، اپنی متاع حیات کو اپنے سے لگا لیا تھا۔

”ہاں میں دوسں کا تمہیں، مگر تم رومست۔ شاباش۔“ اپنا ہاتھ اس کے اٹکھے ہوئے بالوں میں الجھایا تھا۔ اسنے میں ڈاکٹر رضوی آگئے تھے۔

”پلیز۔“ ڈاکٹر رضوی ان کے پاس چلے آئے تھے۔ وہ تو بے خبر تھا اپنے ارد گرد کے ماحول سے۔ وہاں تو سب لوگ کھڑے ان ہی دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے کتنی مشکوں سے اپنے سے الگ کیا تھا۔

”نن..... نہیں، نہیں، کھنکھن میں یہیں لگاؤں گی، مجھے اس سے تکلیف ہوتی۔“ ڈاکٹر رضوی کے ہاتھ میں انجکشن بکھرے اس نے دیکھا تو گھبرا کر دوبارہ سے کھنکھن کے مضبوط و کشادہ سینے میں سر چھپایا تھا۔

”مجھے یہاں سے لے چلو کھنکھن! مجھے یہاں سے لے چلو۔“ اس نے کھنکھن کی شرٹ دونوں مٹھیوں سے دبوتی تھی۔ وہ انتہائی جذباتی ہو رہی تھی۔ ڈر و خوف سے جان لٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہاں لے چلوں گا۔ تم یہ لگوا لو۔“ ڈاکٹر رضوی نے اس کی ہی مدد سے مشکا کے انجکشن لگایا تھا، جو پیچ رہی تھی، اور اس کی پیچوں سے تمام اسٹاف، تمام اپتال کے مریضوں سے ملے والے لوگ اس کمرے میں جمع تھے۔ انجکشن لگتے ہی وہ ہوش و خورش سے بچکے نہ ہوتی چلی گئی تھی۔

کھنکھن کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مشکا کی حالت کا کون ذمے دار ہے؟ کے قصور وار ٹھہرائے وہ؟ لگتے ہی لگے وہ بیڈ پر بے ہوش وجود کو کئے گیا تھا۔ اور پھر اپنی عزیز ہستی، اپنی کل کائنات پر جھک کر اس کی کشادہ پیشانی پر اپنے پیانے کی ہیر شبت کر دی تھی۔

ڈاکٹر رضوی نے تمام لوگوں کو باہر بھیجا تھا۔ تنہی علی حسنین نے آ کر اسے چوکا دیا تھا اور وہ بچکے گی کے انداز میں اٹھ کر اس کے ہاتھ آگے بڑھنے لگا تھا۔ سامنے کھڑی سمرنا میہ یوسف کی سمت جا رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو بہت روکنے کے باوجود بولنے سے روک نہ پایا تھا۔

”کیوں کیا آپ نے اس طرح؟ کس ختم کا بدلہ لگالا ہے آپ نے مشکا سے؟ میرے گھر سے اسی لیے آپ اسے لے کر گئی تھیں؟“ علی حسنین اسے وہاں سے ہٹاتا چاہ رہا تھا، مگر وہ اس وقت نہایت جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے کندھے سے علی حسنین کا ہاتھ بری طرح جھٹکا تھا۔

”کیا حال کر دیا ہے آپ نے میری مشکا کا؟ جسے میں نے سینٹ سینٹ کر رکھا تھا۔ ہلکی سی خراش تک آنے نہ دی تھی۔ آپ نے اسے زندگی اور موت کے بیچ میں لا کھڑا کر دیا۔ جب حفاظت نہیں کر سکتی تھیں تو کیوں لے آئیں آپ مشکا کو کوما جانی کے پاس سے؟ بولے جواب دیجیے؟ ایسا کون سا راز ہے جس کی وجہ سے آپ نے مشکا کے ساتھ یہ سب کیا؟“ سمرنا میہ یوسف شرمندہ شرمندہ کی سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اپنے دل کی عدالت میں اپنا ہی تجزیہ کر رہی تھیں۔ کہاں ان کے وہ، وہ گمان میں تھا کہ مشکا ان کی بے انصافی پر اتنا برا اقدام بھی اٹھا سکتی تھی۔ وہ تو اب روزِ محشر یوسف خان کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

”اور آپ مہلک!“ کھنکھن، سمرنا میہ یوسف کی سمت سے رخ پھیر کر سر جھکائے مہلک کی جانب پلٹے تھے۔

”آپ تو مشکا کی بڑی بہن تھیں نا، آپ تو جانتی تھیں نا کہ مشکا میرے لیے کیا ہے۔ بہت خوب، آپ نے بھی بڑی بہن ہونے کا خوب غرض نبھایا ہے۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے مشکا کو اپنے ساتھ ہی لندن لے جانا تھا۔ یاد رکھیے گا آپ دونوں، اگر مشکا کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو لوں گی۔ صاف نہیں کروں گا۔“ وہ لگتے لہجے میں انگارے برسانے لگا تھا۔

”مگ لگا دوں گا میں ساری دنیا کو۔“

”کھنکھن! چلو، یہاں سے چلو۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا تھا۔

”بھیکو۔ دیکھ رہے ہیں۔“ لیکن اسے پرواہ کہاں تھی۔ ٹکڑی تو صرف مشکاۃ کی تھی، جو بیچ پر زندگی اور موت کی جنگ

دروہی تھی۔“ معافی نہیں کروں گا سزا سہمہ نہیں، کبھی نہیں۔“ وہ زور سے دہرایا تھا۔

”میں بھی معافی نہیں کروں گا سزا سہمہ نہیں، کبھی نہیں۔“ وہ زور سے دہرایا تھا۔
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

ہوٹ کی مہمانی کی وجہ سے۔ مومئی رضا اور علی حسنین دونوں نے مل کر سلوک کو وہاں سے ہٹایا تھا۔ اس کا قصہ کسی طور کبھی نہیں ہو

’ہاتھا۔ اس کے دل کا آتش فشاں ابھی ٹھیک طرح سے پھٹا نہیں تھا۔
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم
 ”سلوک پہلے بیٹا یہاں سے۔“ مومئی رضا جوہاں مولے پر بیٹھے اگلے چہیتے بیٹے کی باتوں سن رہے تھے، کدیم

☆☆☆

”لہذا آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ یوسف خان میز کے پاس آر کے تھے۔

”جی یوسف! مجھے آپ سے ایک بہت اہم مسئلے پر ڈکشن کرنی ہے۔“ پروفیسر افتخار نہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”پہلے کسی فائبر اپسٹار بول ٹیبل میں چلے جائیں۔“

”وہاں تو اس وقت ایک دوسرے کے آنے سارے بیٹھے تھے۔“

”جی سر! البتہ قوم نے کافی بھی نوش فرما لی۔ اب بتائیے کہ آپ اتنے پریشان و مضطرب کیوں ہیں؟ اور وہ کون سی بات

ہے جو آپ کے لبوں پر آتے آتے رک رہی ہے؟“ یوسف خان نے ان کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ وہ پریشان یا پھر بے چینی

نغمہ کر یوسف خان یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیوں پریشان ہیں؟ کچھ دیر خاموشی رہی۔

تھا۔ اسے میں ڈاکٹر

دہاں تو سب لوگ

میں انکسپشن پکڑے

سے دہلوتا ہی تھی۔ وہ

نہیں آتے تھے اور اس کی

وہ وہ ہوش و

ہے؟ کے قصور وار

پر جھک کر اس کی

دہ وہ بیگانی کے انداز

پ کو بہت روکنے

لے کر

اپنے کندھے سے

آنے نہ دیتی تھی۔

آپ مشکاۃ کو مہما

سبز یہ سب کیا؟“ مسز

ان کہاں ان کے واکم

میں منہ دکھانے کے

تھے۔

آپ نے بھی بڑی

اور کبھی کا آپ

سے رہا نہ تھا۔

”یوسف ایہ تو آپ جانتے ہیں کہ ابھی پچھلے ملتے میں لمبیا کہا تھا۔“
”جی ہر!“

”بیٹا! وہاں میرا ایک بھری دوست رہتا تھا، ایک لڑکا، اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور اس بات کو بھی تو یاد دلاؤ۔“
”میرا اس سے جانا تو سب کو ہی ہے، ایک مذاہب، دن کوئی جلدی چلا جاتا ہے اور کوئی دوسرے یہ جلدی دال سے ہے۔“

اور اب تک رہے گا، ہم آپ کو یوسف اللہ کے کام میں مدد اعلیٰ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن ہم تاہم کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو وہاں خوش کرنے، اعلیٰ مرتبے پر فائز کرنے کے لیے انہیں ایسا مال و مال پہنچاتے رہیں، تاکہ وہ یہ سکون رہیں۔“
”یوسف خان نے انہیں کالی تسلیم کر لی تھی۔“

”لیکن یوسف ارا را میں وہاں نہ فائز سکون ہے اور نہ ہی خوش۔“ ان سے صرف اتنی ہی کہا جا سکتا تھا۔ باقی کے الفاظ ان کے ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔ ”انسوؤں کا ایک گولہ تھا جو محل میں پھنسا تھا۔ یوسف خان دیکھ رہے تھے کہ ان کے سامنے جو شخصیت بیٹھی ہے، جو انہیں اپنے والد محسن کی عزت دیتے تھے، انہیں عزیز رکھتے تھے، وہ اس وقت بہت لمبے ہوئے ہیں۔“
”میرا! لمبیا کون کی بات ہے جسے لے کر آپ اتنے پریشان ہیں؟“ یوسف خان نے بہت جلدی کر کے اپنی جیب ان کی جیب کے قعر پر قریب کر لی تھی۔

”جب میں لمبیا پہنچا تو راستہ کے مکمل نے مجھے فون کرنے کا اپنے گھر بلا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے وہ صحت دیکھ جو راستہ میں سے قبل لکھ کر گیا تھا۔ اس نے اپنی کرداروں کی جائیداد اپنی بیٹی شہلا کے نام کر دی تھی۔ اور یہ ٹارک ذمہ داری تھی پر ڈال دی تھی۔ مکمل سے شہلا کے بارے میں معلوم ہوا کہ شہلا ان سے ملتی نہیں ہے اور نہ ہی فون پر آتی ہے۔ اس خبر نے مجھے بے چینی کے ساتھ ساتھ کچھ شک و دہم میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔“ کچھ دیر کے بعد انہوں نے ایک لمبی دردناک عارضہ کی پٹائی بھیجی۔

”میں شہلا سے ملنے اس کے گھر گیا تھا، مگر ان کی خلیا مہر نے سختی سے مجھے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے طور بہت کوشش کی تھی شہلا سے ملنے کے لیے۔ مگر ہر بار نامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس کا تو مجھے پہلی ہی ملاقات میں انما زاد ہو گیا تھا کہ راستہ کے بھائی، گھر کے باقی افراد، نہایت بدتمیز و بد اخلاق ہیں۔ مجھے ان کے رویوں سے شک کو یقین میں بدان پڑا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھو کہ اللہ کو مجھ پر رحم آگیا تھا۔ وہاں کی ملازمرہ سے مجھے پتہ چلا کہ ان لوگوں نے ہمیں بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ اور اس پر نارہم کرنے کے لیے اسے دن میں دو دفعہ نیند کے انجکشن دیے جاتے ہیں۔ اسی ملازمرہ کی بدولت میں شہلا کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اور اب وہ یہاں اس پاکستان میں میرے گھر پر زیرِ علاج ہے۔“ اپنی آنکھوں کی نمی کو انہوں نے دکھ سے صاف کیا تھا۔ یوسف خان کو بھی اس انجان بڑائی کے بارے میں دکھ ہوا تھا۔

”لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شہلا کے خلیا مہر چپ نہیں بیٹھیں گے۔ وہ اسے حاصل بلکہ شہلا کے ذریعے کراروں کی جائیداد پر ہر طرح سے حاصل کریں گے۔ اور خود شہلا کی یہ کنڈیشن ہے کہ نہ تو وہ زندوں میں سے اور نہ مردوں میں۔ شہلا کی حالت دیکھ کر میرے رونگٹے کانپ اٹھتے ہیں۔ تو کیا راستہ کی مدد نہیں تو پتی ہوئی؟ اس کی تو اگلی ٹوٹ بکھرتی ہے۔“ اب کے ان کا مہر کا پناہ لہر بن گیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے تیزی سے آنسو راناں تھے۔

”میرا آپ پریشان مت ہوں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ اپنے بندوں کی بہتری ہی چاہتا ہے۔“ یوسف خان نے ان کے بہتے آنسو صاف کیے تھے۔

”یوسف! میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ لیکن آپ کو میں نے بالکل اپنا بیٹا ہی سمجھا ہے۔“

”جی ہاں جانتا ہوں۔“

”تو کیا آپ میری مدد کریں گے؟“ انہوں نے یوسف خان کی سمت آس جبری نظروں سے دکھایا۔

”آؤں کورں، کیوں نہیں۔ میرے لائق جو خدمت ہو آپ کہہ سکتے ہیں۔ میں ہر طریقے سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ یوسف خان نے ان کے ہاتھ پکڑے تھے۔

”پھر یوسف بیٹا! آپ شہلا سے شادی کر لیجیے۔“

”جی سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ بھونپکا ہی تو رہ گئے تھے۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ہر خدمت کے لیے تیار ہیں؟“

”وہ سب تو ٹھیک ہے سر! لیکن میں۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ میری ذہنی اور ایک عدد بچی کے والد بھی ہیں۔ لیکن میں بھی میں جانتا ہوں کہ شہلا کے لیے آپ کے علاوہ اور کوئی شخص نہیں ہے، جسے میں شہلا کی ہر درگی سونپ سکوں۔ اور آپ کا انتخاب میں نے بہت موقع سمجھ کر کیا ہے۔ ایک تو یہ آپ ریس نہیں ملی کے اچھے ذرا نادر داریے ہیں، جو پیسہ ہی سب کچھ نہیں سمجھتے، اور دوسرا یہ کہ شہلا کی بگڑی حالت کو صرف آپ ہی ٹھیک کر سکتے ہیں، ورنہ ان کے گھر والوں نے مارنے میں کوئی کسر نہیں اٹھارہ گی ہے۔“ سرانفخا، یوسف خان کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اور وہ چنگیز آپ کی وائف، تو انہیں ہم بعد میں کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر بتا دیں گے۔ بیٹا! پتھر میں آپ سے ریکورسٹ کرتا ہوں، آپ شہلا کو اپنا لیجیے، اس مضموم کو وہ حق اور وہ خوشی دیدیجیے جس کی وہ حق دار ہے، تاکہ راجیل کی مدد کو شادی مل سکے۔“ ان کے لہجے میں بہت امید تھی۔ بہت آس بھری نظروں سے وہ یوسف خان کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ابھی بھی نمی تیر رہی تھی۔ چہرے پر افسردگی کی پرتھوٹی تھی۔ اور یہ سب نرم دل یوسف خان سے دیکھا نہیں گیا تھا۔ یوسف خان کی ایک جھوٹی سی ہاں نے سرانفخا کو بہت خوشی بخشی تھی۔ وہ نہال ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر خوشی کے جو رنگ تھے، آنکھوں میں جو ستارے جھلما رہے تھے، یوسف خان نے اپنے آپ کو بہت پر سکون محسوس کیا تھا۔ وہ کافی دیر تک انہیں منٹھی نظروں سے دیکھتے چلے گئے تھے۔

آج کی شام شہلا، راجیل زبیدی سے شہلا یوسف خان، باوٹی گئی تھیں۔ آخر کار شہلا یوسف کو ان کے گھر والے لینے آچکے تھے۔ لیکن یوسف خان جیسے اثر و رسوخ رکھنے والے بندے کے آگے ان کی ایک نہ چلی تھی۔ وہ دھمکیاں کیا دیتے وہ تو خود یوسف خان کی دھمکیوں سے ڈر کر تاکا کا ملوث گئے تھے۔

اب شہلا کو سنبھالنا یوسف خان کی ذمہ داری تھی۔ جسے وہ ایما ننداری سے نبھانے کو تیار تھے۔ پہلی ہی نظر میں وہ لڑکی انہیں نہایت مضموم اور معمولی بھالی سی لگی تھی۔ بے ظلم و ستم سے وہ کافی حد تک ڈر خوف زدگی کی زد میں تھی۔ مگر یوسف خان نے اپنے پیار کی چھاؤں میں لے کر اسے ساتوں رنگوں میں بھگو ڈالا تھا۔ یوسف خان ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے تھے۔ انہی بات نہ سمجھ کر وہ اپنی پہلی بیوی نامیہ کو بھول گئے ہوں، بلکہ وہ ان کے کبھی تمام حقوق و فرائض ایما ننداری سے نبھاتے تھے۔ وہ مزاج کی کچھ تیز تھیں، جس کی وجہ سے یوسف خان نامیہ کے چڑچڑے پن سے تیرا کر اپنا زیادہ تر وقت شہلا کی نگہداشت میں گزارتے تھے۔ خندا مزاج، دھیما لہجہ، مدہم آواز اور پیار لانے والی شہلا کے وہ چند دنوں میں ہی گرویدہ ہو گئے تھے۔ یوسف خان کے دل میں شہلا کی محبت و عزت میر اور بڑھ گئی تھی۔ جب شہلا نے انہیں بطور تحفہ ایک پیاری سی بیٹی دی تھی، لیکن شاید کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ خوشی اور غم کا چوٹی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ شہلا کے نصیب میں بہت کم خوشیاں لگھیں گی تھیں۔ اور اپنے حصے کی وہ سب خوشیاں لے کر، وہ اس دنیا سے یوسف خان کو چھوڑ کر اپنی بیٹی کو چھوڑ کر، ہمیشہ کے لیے چلی

کہ کو بھی تقریباً دو سال کا

یہ سلسلہ تو از ل سے ہے
ماضی پر کر سکتے ہیں کہ ان
تاکہ وہ بہ سکون ریں۔

ان کے سامنے جو شخصیت
ہے ہوئے ہیں۔
بوکر، اپنی جبر ان کی جبر

وہ وہ صحت دہی جو راجیل
یہ تازک ذمہ داری مجھ پر
ماضی قاتی ہے۔ اس جبر نے مجھے
لیں سرور سائل خارج کی

میں نے اپنے طور بہت
قات میں انما زہ ہو گیا تھا
کو یقین میں بدلایا تھا۔
ن نے جس بے جا میں رکھا
اسی ملا زہد کی بدولت میں
و اراج ہے۔“ اپنی آنکھوں کی

یہ پہلا کے ذریعے کر ڈوں کی
ہے اور نہ مردوں میں۔ شہلا
و ا لگوئی لنت بگڑ گئی۔“ اب
ہی چاہتا ہے۔“ یوسف خان

گئی تھیں۔ یوسف خان کے تو دل کی دنیا ہی اجڑ کر رہ گئی تھی۔ ان کا بھی اس دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ مگر انہیں جینا تھا۔ اپنی اور شہلا کی مشترک رحمت کے لیے، اپنی بیٹی شکارۃ کے لیے۔

شہلا کے جانے بعد وہ شکارۃ کو لے کر سامیہ کے پاس چلے آئے تھے۔ سامیہ نے تو بگڑا مہی برپا کر دیا تھا۔ پورے خاندان کو اکٹھا کر لیا تھا۔ پورے خاندان کو یوسف خان نے ساری حقیقت بتائی تھی۔ یہ شادی نیکی کے جذبے سے لبریز ہو کر کی تھی، مگر چونکہ اب شہلا انہیں تھیں تو یوسف خان کو سب نے معاف کر دیا تھا، سوائے سامیہ کے۔ اپنی کم مائیگی کا بدلہ انہوں نے ہمیشہ چھوٹی سی مصوم شکارۃ سے ہی نکالا تھا۔ یوسف خان یہ سب دیکھ کر دھیرے دھیرے گھونٹ لی کر رہ جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نہ کبھی تو سامیہ کے دل میں شکارۃ کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہوگا۔ مگر وہ غلط سوچتے تھے، کیونکہ نامیہ کا دل انہیں پتھر ہے، جو کبھی نرم نہ ہو سکتا ہے اور نہ نرم ہو سکتا ہے۔ یوسف خان نے شکارۃ کو چٹنا ہو سکتا تھا پیرا دیا تھا۔ ان کی گرتی صحت، نے بھی نامیہ کو نرم نہ کرنے پر مجبور نہ ہونے نہ دیا تھا۔ شہلا کے جانے کے بعد یوسف خان کی زندگی اداس و دیران ہو کر رہ گئی تھی۔ شہلا کی یاد نے ہر لمحہ انہیں بے گل ہی رکھا تھا۔

”سامیہ! میری زندگی کا کوئی بھرپور نہیں ہے۔ جانے موت کا پروانہ کب مجھ پر حاوی ہو جائے۔ اور جسم سے روح کسی بے قرار تنہائی کی طرح پرواز کر جائے۔ میری تم سے اتنی سی اتھار ہے، تم میری بیٹی شکارۃ کو اپنی نرم آغوش میں تھوڑھکی جکڑ دے دو۔“ وہ ہنسنے لپٹے تھے اور شکارۃ ان کے سینے پر برسر رکھ سو رہی تھی، جس کے زری سے دھیرے دھیرے بال ہمارا ہے تھے۔ ”اور پلیز اگر تمہارے دل میں میری تھوڑھکی ہی بھی عزت ہے، اسی عزت کے واسطے تم شکارۃ کو نہ کبھی مویٹیلے ہونے کا طعنہ مت دینا، ورنہ میری بیٹی ٹوٹ جائے گی، بکھر جائے گی۔ پلیز سامیہ! بس اتنا ظلم نہ کرنا اس پر۔“ پھر تو انہیں مشکارۃ کا مصوم چہرہ بھی نہ روک سکا تھا، کردہا کیلے رہ جائے گی، تنہا ہو جائے گی۔

☆☆☆☆

سمر سامیہ موی کو وہ مصوم کی، چھوٹی سی، دو سال کی بچی بہت پسند آتی تھی۔ جس کے چہرے پر ایک اداسی بھی تھی، ان آنکھوں میں ایک تکلیف دہ بھی تھی انہوں نے، جیسے وہ پیار کی پیاسی ہو، وہ اسے اپنی بڑی آپا سمر نامیہ یوسف کی اجازت سے اگے گھر لے آئیں تھیں، اور پھر مشکارۃ کا مصوم بچپن اس گھر میں بلق کے ساتھ گزارا تھا۔ ان کی مصوم مصوم شرارتیں، ان کی ہنسی، تالافاریاں انھی گھر میں گونجنے لگی تھیں۔ سامیہ موی اور موی رضا اس خوشی پر بہت سرشار تھے۔ مشکارۃ کو یہاں بھر پور پیار ملا۔ بلق میں تو جیسے اس کی جان تھی۔

”آہ..... خیر کھولو۔“ ڈانٹنگ ٹنل پر سب ناشہ کرنے بیٹھے تھے۔ اور کھلانے سے پہلے بلق اپنے ہاتھ سے پہلا قصہ مشکارۃ

کو کھلاتا تھا اور مشکارۃ، بلق کو۔ ان کا پیار دیکھ کر سمر سامیہ موی اور موی رضا دل ہی دل میں ان کے لیے دعا میں مانگتے نہ تھتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ہر خوشی، ہر غم میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ نہ وہ اسے کسی دکھ و تکلیف میں مبتلا دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی مشکارۃ، بلق کو کسی پریشانی میں۔ مشکارۃ ایک دن پیار پر گئی تھی۔ بلق نے پوری رات اس کے سر ہانے بیٹھے گزار دی۔ کبھی اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتا، کبھی اس کا ٹیپر پیر چیک کرتا، تو کبھی اسے دوائی کھلاتا، گوکہ اس نے تین دن تک اسے بہت سنبھال سنبھال کر اس کی کیڑی کی تھی، اور جب وہ صحت مند ہو گئی تو گھر میں اس کا جشن صحت بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔

”سما! مشکارۃ کو کبھی میرے ساتھ کھینچ دیں نا۔ میں اس کے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔“ وہ دونوں سمر سامیہ موی کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور سامنے موی رضا بر اجماع انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ بلق کو اہم الی اے کرنے لندن جانا ہے۔ اور وہ مشکارۃ کے بغیر جانے کو راضی نہ تھا۔

”بیٹا آپ اپنی بڑھالی کپیٹ کر آج جاؤ۔ پھر ہم مشکاۃ کو دیکھ بیٹھ کے لیے یہاں لے آئیں گے۔ پھر آپ دونوں جہاں جاتا ایک ساتھ جانا۔ اوکے۔“ انہوں نے اسے پیار سے کہا تھا۔

”اور پھر بیٹا آپ کی آئی کا بھی تو کچھ حق ہے نا مشکاۃ پر۔ وہ بھی تو مشکاۃ کو بڑے پیار سے اپنے آ رہی ہیں۔ آپ لندن سے ہواؤ۔ پھر مشکاۃ دوبارہ ہمیں آ جائے گی۔“

”اوکے ما جانے میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن آپ سب نے میری مشکاۃ کا خیال رکھا ہے۔ ہر طرح سے اس کی نیکو کرنی ہے۔ یہ یہاں میری امانت ہے ما جانے اور بابا جانے!“ بلوٹ نے باری باری دونوں کو دیکھا تھا۔ اور انھیں مشکاۃ کے پاس آ بیٹھا تھا۔ ”اور مشکاۃ تم ہر روز مجھے فون کرو گی۔“ اب ان کے عہد وعدہ شروع ہو گئے تھے۔

”ہاں میں تمہیں فون کروں گی، لیکن بلوٹ تم مجھے فون کے ساتھ پیکر لکھو گے۔ ہر چند وہ دن میں ایک پیکر ضرور آتا چاہیے، کیونکہ مجھے پیکر لکھنے میں حیرت آتا ہے۔ اور یہ میرا حکم ہے تمہارے لیے۔“ وہ دھونس سے بولی تھی۔ اس کا انداز ہی ایسا تھا جس پر سب ہی مگر ادا بنے تھے۔

”مشکاۃ! میں جا رہا ہوں۔ لیکن آج سے پانچ سال بعد ہم دوبارہ ہمیں ملیں گے۔ ان پانچ سال میں تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ میرے ہر خط کا جواب چاہیے وہ بھی دو ماہ میں سے پھر پور۔“ بلوٹ نے دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی، جسے سن کر وہ کانہ کی نوڈوں تک سرخ ہو گئی تھی۔

”اوکے اللہ حافظ۔“ سب سے ملنے کے بعد آخر میں وہ بڑے پیار سے اس کے گلے ملا تھا۔ اور ہاتھ ملا کر پاکستان کی سرزمین عبور کر گیا تھا۔

بلوٹ کے بہت سے خدائے فون کا لڑائیں مگر سرنامیہ یوسف اور مہک نے مشکاۃ سے سب کچھ چھپا لیا۔ سرنامیہ یوسف کو مہک کا مستقبل نہایت شاندار لگا تھا، بلوٹ رضا کے ساتھ رکھ کر۔ بلوٹ سے وہاں جموٹ بول دیا گیا تھا کہ ”مشکاۃ اپنی ضرورت برقی سے پڑھائی کے سلسلے میں کراچی شہر سے باہر چلی گئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ انہوں نے سرنامیہ موی کو بھی سخت سے منع کر دیا تھا کہ بلوٹ تک مشکاۃ کی اور مشکاۃ تک بلوٹ کی کوئی بات نہ پہنچی چاہیے۔ وہ بلوٹ اور مشکاۃ کو ملا کر دوبارہ کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔“

سرنامیہ موی کی اس دوران بے انصافیاں اور مہک کی بدتمیزیوں نے بہت سی تھکنیں، مگر وہ پھر بھی چپ رہی تھی، کیونکہ اس کے دل میں ایک شخص آباؤ تھا، جسے سوچنا، جس سے باتیں کرنا ہی اس کا کام تھا، یا پھر وہ اپنی بی بی جان میں لگی رہتی تھی۔ ان کی باتوں پر کان دھرتا، ان کی بنیادیں فونیوں کو سوچا وہ چھوڑ چکی تھی، کیونکہ اس دوران کی اس کی دوستی ماریہ اور علی سے ہو چکی تھی۔ مگر جب ساری ہی حدیں ختم ہو گئی تھیں، مہر جواب دے گیا تو مشکاۃ نے اپنے اندر بدتمیزی اور خود سری کو گھر کر لیا تھا۔ کسی کا بھی لحاظ نہ کیے بغیر انہیں جواب دینا، ان سے بدتمیزی و بد اخلاقی سے پیش آنا اس کی سرشت میں شامل ہو چکا تھا، چونکہ سرنامیہ یوسف ایک نامور مشعل دیکھ تھیں، شیم و سکین بچوں کے لیے کام کر رہی تھیں، اس لیے مشکاۃ کی بدتمیزیوں کی بدتمیزیوں کو ایک بڑے گھونٹ کی طرح بی جاتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اخباروں کے ہاتھ ان کی کوئی ایسی اٹنی سیدھی حرکت آئے اور وہ وہاں بٹھ جانے میں کوئی تانی نہیں رکھتے تھے۔ سرنامیہ یوسف ہمیشہ ہر جگہ مہک کو اپنے ساتھ رکھتی تھیں اور مشکاۃ کو ہر طرح آگاہوں، اس بات سے بے خبر کہ وہ کہاں اور کس سمت والی دواں ہے۔

بلوٹ کو دواں علی حسنین کی شکل میں ایک ایسا ماٹھی مل گیا تھا۔ جس سے وہ مشکاۃ اور اپنی دیوانگی کے قصے سنا تھا۔ علی حسنین، بلوٹ کا ایک اچھا اور سچا دوست ثابت ہوا تھا، جو کہ ہمیشہ بلوٹ کو یوان کہہ کر چھپیرا کرتا تھا۔

☆☆☆

میں بیٹا تھا۔

سے خاندان
بہر کی تھی،
انہوں نے
خیال تھا کہ
رہے، جو کبھی
نے بھی نا سیکو
ہلکا کی یاد نے

ہے
روح کی ہے
کی جگہ دے
لار ہے تھے۔
ہوئے کا طعنہ
شکاۃ کا مصوم

ان
میں بھی تھی، ان
تف کی اجازت
مصوم شرم اڑتیں،
شکاۃ کو یہاں

سیلا تھو مشکاۃ
نہ تھے،
میں چلا دیکھ
س کے سر ہانے
کھانا، کو کہ اس
جس صحت بڑی
میں کے دائیں
موی کے دائیں
ہے۔ اور وہ

”لیکن کوئی تو صل ہونا چاہیے ماسکے کا؟“ وہ جو کب سے بیٹھا ان کی بحث رہا تھا، یکدم بول پڑا تھا۔
 ”ہاں، سچی باتیں نہیں ہوگا؟ ضرور ہوگا اس سکے کا صل بھی۔ بشرطیکہ حکومت اس پر کار بند ہو جائے۔ ہر شخص اپنے فرائض ادا انداری سے نبھائے تو کیسے کوئی اس ملک کو ترقی کی بہت آگے کی منزل تک جانے سے روک سکتا ہے۔“ ڈاکٹر رضوی نے

کہے۔

ہاتھ میں بندھی گھڑی دیکھ کر اسی اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تھے۔
 ”ایک سیکورٹی گاڑی لا کچھ لی، مجھے اس گرم گرم بخت کو نہیں چھوڑنا پڑے گا، کیونکہ اس وقت مجھے ایک اہم پتہ مل گیا ہے۔ لیکن انشاء اللہ ہم پھر اس بحث کو نیکٹ ملاقات میں نہیں پھنس کر رہیں گے۔ فی الحال آپ لوگ مجھے اجازت دیجیے۔“ ٹیبل پر سے اپنا پیٹھو اس کو پ اور فرسٹ ایڈکس اٹھایا تھا۔ جاتے جاتے انہوں نے سلجوق کے کندھے پر ہاتھ دھرا

تھا، جو کسی گہری سوج میں مکمل ڈوبا ہوا تھا۔

”بیٹا! آپ اتنا زیادہ نشہ مت لیں، ورنہ بیمار پڑ جائیں گے۔“ پیار سے سمجھاتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئے تھے۔
 سلجوق خود بھی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور آ کر مشکاۃ کے بیڈ کے پاس رکھی چیز پر براجمان ہوا تھا۔ اور بیڈ پر بے سادہ پڑی نازک سی لٹری کو نکلتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ اسپتال کی بالکنی میں بہت کم صبر سا بیٹھا تھا، جب ہی سرنژامیہ یوسف چل آئی تھیں۔
 ”سلجوق! انہوں نے ہولے سے پکارا تھا۔ وہ چونکا تھا۔ اور کچھ لمحوں تک انہیں نکلتا چلا گیا تھا۔ پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا

تھا۔

”آپ تو شمل و کر ہیں نا، تیتیم و مسکین کی مذکورہ والی، ان کے حقوق کے لیے لڑنے والی، گھنٹوں ان کے لیے کھینچ پھینچ کر رہیں کرنے والی، تو کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ فریب تھا؟ دیکھ کر تھا؟ کیا تھا سب؟ بولیں کیا تھا وہ سب؟“ جذبات میں آج

اس کی آواز تھوڑی اونچی ہوئی تھی۔

”کیوں کیا آپ نے مشکاۃ کے ساتھ اس طرح وہ آپ کی سبکی ادا نہیں تھی۔ صرف اس لیے آپ نے ایسا سلوک اختیار کیا، سے آپ کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ مہربان کی طرح وہ آپ کی سبکی ادا نہیں ہوئے نہیں دوس گا۔ آپ کے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ لیکن ان نہیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ اب میں صرف اسی کی جگہ ہے۔ اب میں مشکاۃ پر آپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔“
 نہیں، لیکن میرے گھر میں میرے دل میں صرف اسی کی جگہ ہے۔ اب میں مشکاۃ پر آپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔“
 اس نے روٹی ہوئی سرنژامیہ یوسف کو تیز نظروں سے دیکھا تھا۔ اور ان سے دو قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ آج پھر جذبات و غصے کی لپیٹ میں تھا۔ نہ وہ اس وقت کچھ سمجھ رہا تھا اور نہ سوج رہا تھا۔ صرف بول رہا تھا، جو کچھ منہ میں آ رہا تھا۔ مشکاۃ کی بحث میں بول رہا تھا۔ ”کاش، کاش کہ میں یہاں آ کر مشکاۃ کی پہلی ملاقات میں سب کچھ جان جاتا، تو آج یہ

نہت نہیں آتی۔“

اس نے ان کی سمت سے اپنا رخ ہی پھیر لیا تھا۔ خاموشی کا یہ راج کوئی دس منٹ تک رہا تھا۔
 ”میں جانتی ہوں میں نے ان کی سمت سے اپنا رخ ہی پھیر لیا تھا۔ خاموشی کا یہ راج کوئی دس منٹ تک رہا تھا۔ بہت تکلیف میں رکھا ہے۔“
 جس کا منہ مڑا دیا کہ کرنا چاہوں تو شاید زندگی کی آخری سانس تک نہ کر پاؤں گی۔ انہوں نے ساڑھی کے پلو سے اپنے بچے

آسو صاف کیے تھے۔

”مجھے صاف کر دیجیے سلجوق! میں آپ کی امانت کی حفاظت نہ کر پائی، لیکن مجھے ایک موقع اور دیجیے کہ اب میں آپ کو کوئی شگایت نہ بولنے دوں گی۔ پلیز سلجوق! مجھے صاف کر دیجیے۔“ وہ دور ہی تھیں، معافیاں مانگ رہی تھیں۔ اور وہ بت بنا کھڑا

ان سے نظریں پھیرے کسی اور سمت تک رہا تھا۔

”سبحو حق! جب کوئی اتنی عاجزی سے معافی مانگے، تو بیٹا! اسے معاف کر دینا چاہیے، کیونکہ اللہ بھی اپنے پیارے بندوں کی بہت سی خطا میں، غلطیاں درگزر کرنے والا ہے۔“ موسیٰ رضا نے سبحو حق کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”ہاں بیٹا! سبحو حق! معاف کر دیجیے آپا کو۔“ مسز سامیہ موسیٰ نے اپنی بڑی بہن کے جواز سے دونوں ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ جس عورت نے کبھی سواری ہونا بھی گوارہ نہ کیا ہو وہ اس وقت دونوں ہاتھوں کو جواز سے شرمندہ دنا دسر جھکا گئے کھڑی معافی کی طلب گار تھی۔ سبحو حق نے پلیٹ کر مسز سامیہ موسیٰ اور موسیٰ رضا کو لٹکا تھا۔ اور پھر روتی ہوئی مسز سامیہ یوسف کو۔

”آئی ایم سوری بابا جانی! لیکن اس وقت میں اس پوزیشن میں بالکل نہیں ہوں، یا شاید میں ابھی اتنا اعلیٰ طرف نہیں ہوں۔ بابا جانی! مشکلات میرے وجود کا بہت خوبصورت حصہ ہے، جسے میں نے اپنے دل میں اس طرح رکھا ہوا ہے کہ اگر آپ دیکھ سکتے، یا کوئی بھی دیکھنے والی آنکھ ہو تو رشک کیے بنا بندہ رکے۔ اور اسی مشکلات کو جتنی تکلیف اس وقت ہے۔ اس سے کئی گنا میں سہم رہا ہوں۔ یہ تکلیف، یہ درد، یہ اذیت، برداشت کر رہا ہوں۔ اور بابا جانی! میں انسان، ایک مٹی سے بنایا ہوا، بے شک غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہیں، لیکن آنٹی نے جو غلطی جان بوجھ کر نہیں کی، وہ ناقابل برداشت ہی نہیں ناقابل معافی ہے۔ آئی ایم سوری بابا جانی! میں آپ کا یہ سچ نہیں مان سکتا۔ میرا دل آپ کی طرح بہت بڑا نہیں ہے۔ بہت چھوٹا دل ہے۔ میرا مشکلات کے معاملے میں۔ اور آنٹی نے تو میری قیمتی شے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ نہیں بابا جانی! میرے لیے سب اس وقت تک صرف اور صرف مشکلات کی صحت یابی کے لیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں کسی کو معافی کے کوئی لفظ ادا کرنے نہیں دوں گا۔ جب تک میری مشکلات میرے سامنے بالکل اسی طرح ٹھیک ہو کر نہیں آجانی، جیسے میں اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔“ وہ مسز سامیہ یوسف پر ایک نگاہ غلط ڈال کر وہاں سے ہٹا چلا گیا تھا۔ موسیٰ رضا کی نظروں نے بہت دور تک اس کی چوڑی پشت دیکھی تھی، جبکہ مسز سامیہ یوسف کے آنسوؤں میں مرید روانگی آئی تھی۔

☆☆☆☆

وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے گلے زار و قطار دروہی تھیں۔ کتنی پیاری تھی وہ اس محبت کی، اس چاہت کی، کہنا توڑ پاتی تھی، تری تھی وہ ماں کی اس پُر نور ممتا کے لیے۔ آج اس وقت وہ اپنے سارے صاحب بے باق کر رہی تھی۔ اس کے دل کے سارے زخم جیسے مندمل ہونے لگے تھے۔ آنکھیں اس بے پناہ محبت کو حاصل کر کے خشک ہونے کو راضی نہیں تھیں۔ جسم کا روڈاں وڈاں اس وقت اپنے اللہ کا شکر گزار تھا، جس نے اسے بھی یہ پاکیزہ محبت سے نوازا دیا تھا۔

مسز سامیہ یوسف، مشکلات کو خود سے لگائے رو رہی تھیں، اس کے بالوں کو نرمی سے سہلا رہی تھیں، تو کبھی اس کا چہرہ ہاتھوں میں پھرے پیار سے چوم رہی تھیں، کتنی ہی معافیاں مانگتی تھیں، بگڑاؤ کر ایک ماں نے اپنی بیٹی سے۔

”مما جانی! آج کیا سارا پیار مشکلات کے لیے ہے۔ میں بھی تو ہوں۔“ مہک ماں اور بیٹی کے اس خوبصورت ملن پر بہت خوش تھی۔ بے شک غلطیاں، نا انصافیاں اس سے بھی سرزد ہوئی تھیں، جس کا وہ ازالہ کرنے کو بالکل تیار تھی۔ اس وقت وہ بھی مشکلات کے قریب چلی آئی تھی۔ اور اس کا زہم و نازک ہاتھ تھا ملایا تھا۔ مشکلات نے مہک کو کمر کے دیکھا تھا۔

”آف کورس مائی چائلڈ! میرا سارا پیار صرف آپ ہی دونوں کا تو ہے، لیکن اس وقت مشکلات کے لیے ہے۔“ انہوں نے پیار سے اس کی کشادہ پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

”یعنی کداس وقت میرا یہاں کوئی کام نہیں۔“ وہ مسنما کی تھی۔

”اگرے رے رے، ماما جانی! مہک تو ناراض ہوگئی۔“ مشکلات نے جھٹ اس کا ہاتھ تھا تھا۔

”مہک! ماما جانی تو جو کچھ کر رہی ہیں۔“ مشکلات کا چہرہ یکدم سید پر گیا تھا۔

”اونو! مشکلات لولی! تو میں کون سا سیریس لے رہی تھی۔ تم بالکل ہی سید ہو۔“ مہک نے اس کی رجحان دیکھ کر گھبرا کر اس کا

ہاتھ اپنے لمبوں سے لگایا تھا۔

”ڈیڑ آج ہم دونوں مہمان جانی کے کمرے میں ڈیڑ اڑا لے رکھیں گے۔ خود بھی باگیں گے اور مہمان جانی کو بھی دکھائیں گے۔“
او کے ”مشکلات کے امیر لہوں پر مسکراہٹ دیکھ گئی تھی۔ سزنا سمیہ یوسف نے دونوں بیٹیوں کو متاثر نہیں نظر لیا تھا۔

مشکلات کو اسپتال سے ڈیڑ چارج ہوئے دونوں ہوئے تھے۔ جب اسے ہوش آیا تھا تو اس کی نظر سب سے پہلے اپنے سامنے کھڑی سزنا سمیہ یوسف پر پڑ گئی تھی۔ جو تب تاحہ بے آواز آنسو بہا رہی تھیں۔ جن کے چہرے پر فکر کی ہزار گہریں تھیں۔

”تو کیا میری وجہ سے؟“ مشکلات کے دل و دماغ میں جمو کہ ہوا تھا۔ اس کا دل کیلہ رنگی دھڑکا تھا۔ ثقاہت کے باوجود اس کے لمبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نے گھر لیا تھا۔ سزنا سمیہ یوسف لمحوں میں اس کے پاس آئی تھیں۔ گھاس ڈور کے پیچھے کھڑا سلوک کا دل اس منظر پر بہت خوش ہوا تھا۔ دل میں ہزاروں طہینان کے دھبے چل اٹھے تھے۔ دل کی ماری طیش، کمزور تھیں اور نفرتیں جو سزنا سمیہ یوسف کے خلاف تھیں، وہ سب مشکلات کی اس ہلکی سی مسکراہٹ پر مٹ گئی تھیں۔

☆☆☆

رائل پلیس ویلڈ کے سادہ موٹ پر سلورنگ دور دور بڑے ہوئے تھے، جیسے غلیہ آسمان پر چنگاٹے ستارے، چوڑی دار پاجامے کے نیچے سفید پتھر جیسے پیر، سلورنگ کی خوبصورت سینڈل میں سینڈل یا کی طرح مقید تھے، صراحی دار گردن میں سلورنگی گلوں کا جڑاؤ لگو بند اور آویزے، ہلکا ہلکا میک اپ، پھر اوپر سے اس کے چہنچہ کی نازک ادا، گویا وہ سب کے دلوں پر قدم دھرتی فاقہ کن کرن چلی جا رہی ہے۔ وہ اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، جو گاڑی سے اتری اندام کی جانب آ رہی تھی، وہ بھی جلدی سے نیچے آیا تھا۔

”باشا، اللہ، ہماری بیٹی تو آج آسمان سے اتری کی کوئی عورت لگ رہی ہیں۔“ سزنا سمیہ موی نے نرمی سے اسے گلے لگایا تھا۔ آج یہاں خصوصی دعوت تھی۔ اور اسی دعوت کو مد نظر رکھتے ہوئے سزنا سمیہ یوسف اور مہک نے بالخصوص اسے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ اور خود بھی خوبصورتی سے تیار ہوئی تھیں۔ مشکلات کو پہلے تو شک ہوا تھا، مگر اب یقین ہو گیا تھا کہ آج سلوک اور مہک کی شادی کی تاریخ رخصتی جانی ہے، کیونکہ گھر میں کافی خصوصی لوگ بھی مدعو تھے، جن میں علی حسنین اور اس کے پیرنس بھی برائے نام تھے، اور کچھ موی رضا کے رشتیلو بھی موجود تھے۔ مشکلات سب کو سر کر رہی تھیں موی، ایک الگ الگ سگھل موٹے پر پیٹھ کی تھی۔ اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ ماما اور مہک کی محبت پانے کے لیے اپنی محبت کی قربانی دینا، یہ سوچا برا نہیں تھا اس کے لیے۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اپنی بڑی بہن کی ہر خوشی میں خوشی پیش ہوگی۔

”اور بیٹا مشکلات! کبھی طبیعت ہے آپ کی؟“ موی رضا ابھی ابھی اندر سے آئے تھے، جنہیں دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ سلام کا جواب دے کر موی رضا نے اس کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔ چھٹی ہوئی نظریں اٹھائیں تو سامنے ہی سلوک اور مہک ایک ساتھ بیٹھے، اپنی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ اسکا کلمہ موبائل سے بیٹھے بیٹھے گھر لہرا نہ لگا تھا۔ ماحول میں عجیب سی گھٹن کا احساس جاگا تھا۔ اور اس سے پہلے کے اپنے کسی فیئس الیکسپریشن سے کچھ ظاہر ہوتا۔ وہ سزنا سمیہ یوسف سے کھولت سے اجازت لے کر باہر لان میں چلی آئی تھی۔ وہاں سب ہی اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ اس لیے کسی کو اس کی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

دو گھنٹے کے بلکے بلکے سب لے رہی تھی، جو کہ یہ لوگ باہر لان میں آتے وقت سزنا سمیہ موی نے زبردستی پکڑ لی تھی، جیسی اپنا کہ کسی کے سامنوں کی گزری اور وجود کی خوشبو اسے محسوس ہوئی تھی، مشکلات نے گردن زرا سی گھبرا کر دیکھا تھا۔

پیارے بندوں کی

کون دیکھا تھا۔ جس

نے کھڑی معافی کی

تفاہلی طرف نہیں

ماہوا ہے کہ اگر آپ

ہے۔ اس سے کئی گنا

سے بہا پلا، بے شک

نا قابل معافی ہے۔

ت جھوٹا دل ہے میرا

ماہیر ہے یہ لب اس

ادا کر نے نہیں دوس

چھوڑ گیا تھا۔“ وہ سز

لی جی چوڑی پشت دیکھی

بہت کی، کہتا تو بی بی تھی،

اس کے دل کے

اضی نہیں تھیں۔ جسم کا

بسی اس کا چہرہ ہاتھوں

خوبصورت لمن پر بہت

تھی۔ اس وقت وہ بھی

تھا۔

لے ہے۔“ انہوں نے

کے

دیکھ کر گھبرا کر، اس کا

کلمت

کلف لگا سفید کرتا شلوار، مسکور کن خوشبودار، بچے لے مرادانہ وجاہت کے پیکر، اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت بکثرت رضا کھڑا۔

ایک پل کو تو اس کا دل پری زور سے دھڑکا تھا، مگر جلد ہی ہی خود کو تسخّل لیا تھا۔ دھکا کے چہرے پراتے جاتے رہ گئیں کو وہ لغو رہ گیا تھا۔ اور وہ ان رگوں کو کیسے نہ پہچان سکتی تھی۔ وہ ان ہی رگوں کے ساتھ تو رہا تھا۔

”کیا ہوا مشکاکا؟ اندر سے یہاں لان میں کیوں چلے آئے تم؟“

”ایچھو کی اندر میرا دل گہرا رہا تھا۔“ اس نے اپنا رخ مکمل اس کی سمت سے پھیر لیا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے بھی؟“ بلوئن نے اسے شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔ ”وہ ایسے اچھے لگ رہی ہو۔ خوبصورت و خیر آتمیں۔ مگر آج تو تمہاری چھب بڑی لگ رہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں اپنے دل میں چھپا کر بہت دور لے جاؤں۔“ وہ تھوڑا جھکت کر سر گھٹی کے انداز میں بولا تھا۔ شکاک و شبہا کر رہے تھے۔

”لیکن اب ہر خدائش آتی جلدی تو پوری نہیں ہو سکتی تا، اس لیے تمہیں اب بس تھوڑا سا اور انتظار کرنا پڑے گا۔“ اس کا دودھ معنی لچوہہ عکاسۃ کی دھڑکیں تیز کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کی گرفت سے خود کو چھڑایا تھا۔

”میرا خیال ہے اندر چلے ہیں وہ لوگ پریشان ہو رہے ہیں، جب ہی سبجوت نے بہت نرمی سے اس کی نازک کھاتی تمام لی تھی، وہ چونک کر اسے گتے کی تھی۔“

”وہ لوگ جانتے ہیں کہ انہم یہاں ہیں۔ اس لیے تم پریشان مت ہو۔ اور وہ بھی وہ لوگ اندر دم دروڑوں کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا ہوجانے کا پلان ترتیب کر رہے ہیں، یعنی کہ ہمارا شمار کی پلاننگ۔“ اس نے مکرراتے ہوئے مشاکلا کو آرام سے خود میں بیٹھا تھا۔

مشق کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس کی سمجھ سے سبوح کا ہر حرف لفظ کچھ سے بالاتر تھا۔ اسنے میں اسے
مہمب اپنے پاس کرسی مونی دکھائی، وہی تھی۔ مشق کو اپنی پوزیشن کا خیال آتا تو جھٹکے سے وہ سبوح سے الگ ہوئی تھی، جبکہ سبوح
دھیرے سے سکر ادا کیا تھا۔

”اگم سو مری مشکافہ! میں جو کچھ کرنے جارہی تھی، وہ حقیقت میں ہر طرح سے غلط تھا۔ میں نے جان کر تمہارے ساتھ بہت زیادہ باتیں کی تھیں۔ تمہارا دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دینا، مشکافہ!“ مہک نے اسے خود سے لگایا تھا۔

”سلو تو تمہارا تھا، تمہارا ہے اور تمہارا میں رہے گا۔“ اور پھر لاشعاری سوچوں میں غلطی، مشکافہ کے گل پر پیرا کر لیا۔ اور بہت ہی ٹیک دعاؤں سے نوازا تھا۔

”مہک! میرا خیال ہے، تمہیں اندر نظر کشی کیا جا رہا ہے۔“ بلوچ نے آخر کار مہک کو ٹوک کر کہا تھا۔

”جی، میں جانتی ہوں کہ آپ کمبیر اوجڑ، آپ دونوں کے بیچنا گوارا لگ رہا ہے۔“ وہ مسکرائے گی تھی۔

نہا شاہ انداد، سے تم کافی تھخدار ہو۔ ”سکوت نے جان کر چھیر اٹھا۔ مہک اسے مصنوعی گھڑتی ہوئی اندر جا رہے لگی تھی، کہ تک پھر کچھ یاد آنے پر پلٹ کر اس کی سمت آئی تھی۔

”سب سے بڑا حق رضا الہی تو میں آپ کو بخش رہی ہوں۔ لیکن مہندی کی طرح میں بیگ جمع سود وصول کروں گی۔ اس لیے خود کو ٹھیک ٹھاک تیار کر بیٹھے گا۔“ بلوچ کا چہرہ حائلدار رہا تھا۔

”ارے..... رہے یہاں تم کہاں چلیں؟“ مشکا ہنسی بہک کے پیچھے پیچھے جانے لگی تھی، جب سبوتق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا تھا۔

”یہ ہلکے کیا کہہ رہی ہے؟“ وہ ابھی تک ہلکے کی پہلے والی باتوں میں گم تھی۔

”اور سے میری جان! تم پریشان مت ہو۔ اس کو ٹھیک میں کوئی اتنی آسانی سے تھوڑی دودھ لگا۔“ وہ شرارت سے بولا تھا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ وہ جھینپ سی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کھٹے چروال کا مٹیور وہ ابھی طرح جا رہا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ بزنس کے سلسلے میں، میں جو کچھ کر رہی تھی کینیڈا آباد ہوا تھا ایک سال کے لیے، پہلے وہ کہ لوں۔ پھر وہاں سے آ کر تمہیں اپنا ہمیشہ کے لیے نکالوں۔ لیکن ان پانچ سالوں کی بددلی میں جو بھوچال آیا تھا، اسے ہی مد نظر رکھتے ہوئے اب میں اپنی زندگی پر کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے ہم سب نے یہی فیصلہ لیا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں، اور نہ تم سے ہر بہ بددلی کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔“ اس نے آخری جملہ سکرابولا ہوا تھا۔ مشکافہ شرمندگی کے مارے نظر میں چرائی گئی تھی۔

”اور وہ ابھی ہلکے تو اس کا بندوبست بھی تم نے کر دیا ہے۔ علی حسنین نے تو تمہیں صرف تین گھنٹے حراست میں رکھا تھا، لیکن ہم نے علی حسنین کو قید با مشقت عرق کی ہزاروں کے کرہلک کی تحویل میں دے دیا ہے۔ اس کی اتنی ہمت کہ اس نے میری مشکافہ کو تبدیل میں قید کیا۔ اس لیے یہ میری ہزاروںوں کے لیے کافی ہے کہ وہ دونوں کو شادی کے مقصد میں بند کر دیا جائے۔ کیوں ٹھیک کیا تم نے؟“ سنجوق نے اس کی ٹھوڑی سے پکڑ کر، اس کا چہرہ ادھر پڑھا دیا تھا۔ اس کا دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ اندر تک پگھل کر رہ گئی۔ گھبرا کر اندر جا رہے تھے۔ یہ خوشی جو اسے اپنا کھلے ہوئے کو بے قرار تھا، کتنے ہی رنگ تھے جو اس وقت اس کے چہرے پر کھلے تھے، سنجوق کی نظروں کی تلاش اسے اپنے رخسار دیکھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ سائیڈ سے جانے لگی تھی۔

”مشکافہ؟“ اس نے جانی ہوئی مشکافہ کو دیکھی۔ آواز میں لپکا تھا۔ وہ رک گئی تھی۔

”مشکافہ؟“ اس نے کبھی دور نہیں جاؤ گی؟ وہ دودھ کر وہ مشکافہ؟“ وہ یکدم سے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بولا تھا۔ ”مشکافہ؟“

وہ دودھ کر وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی؟“

”نہیں۔“ اس نے اپنا تازہ ہاتھ اس کی منہ بند پہلی ہوئی پتیلی پر دھرا دیا تھا، سنجوق نے ہو لے سے منہ بند کر لی تھی۔

”میں ابھی دودھ کرتا ہوں، تمہیں تہا چھوڑ کر نہیں جاتا ہوں گا۔ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو، لبوں پر اتار اور میری مسکراہٹ تھی۔ اس اپنا ہیبت بھری قربت کے لیے وہ کس قدر ترس رہا تھا۔

”اور ایک بات اور مشکافہ؟ شادی کے بعد مجھے اپنی وہی دانی مشکافہ چاہیے، جسے میں پانچ سال قبل چھوڑ گیا تھا۔ مشکافہ ساتوں رنگوں میں بچکتی ہوئی چاہیے۔“ اس نے بے خودی کے عالم میں اس کا تازہ ہاتھ چوم لیا تھا۔

”نوفرا“ وہ اس حرکت پر ہنس کر رہ گئی تھی۔ ہاتھ چھڑا کر اندر جانے کے لیے مڑی تھی، تو چونک کر قدم ہی تھم سے گئے تھے۔ گاس ڈور کے پیچھے کھڑے علی حسنین اور ہلکے فٹس رہے تھے۔ وہ شرم و دھما کے مارے کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس مصیبت سے سنجوق نے ہی اسے آ کر نکالا تھا۔

مشکافہ کو اپنے بار میں بھرے، وہ ایک ساتھ اندر چلنے لگے تھے۔ دونوں کے چہرے پر آسودگی بھری مسکراہٹ رقصاں تھیں۔ اندر کھڑے وہ دونوں بھی انہیں ایک ساتھ مسکراتا دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ اور انہیں مبارک باد دینے خود باہر کی سمت آنے لگے تھے۔ موسم نے، رنگوں نے ان کا بہت شاندار استقبال کیا تھا۔ چاروں سمت سے جھینپ جھینپ خوشبو بھی ان کے لمبے پر رقصاں تھیں۔

لہو لہو رشنا کھڑا

جاتے رنگوں کو

میں کی آنکھوں

ہے۔ دل چاہ

کافہ پٹنا کر رہ

لے گا۔“ اس کا

نے بہت زری

پر ہمیشہ کے

ہوئے مشکافہ

جئے میں اسے

جیکہ سنجوق

نے ساتھ بہت

پیار کیا۔ اور

نے گئی تھی، کہ

س لیے خود کو

کا ہاتھ پکڑ کر،